اسلحۂ جنگ
مصنفہ میجر جنرل محمد اکبر خان
فیروز سنز پرنٹرز پبلشرز بک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز

اسلحہ جنگ
مصنفہ میجر جنرل محمد اکبر خان
فیروز سنز پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز

ماضی ——— حال ——— اور مستقبل

کا

اسلحہ جنگ

میجر جنرل محمد اکبر خاں
کرنل کمانڈنٹ رائل پاکستان آرمی سروس کور
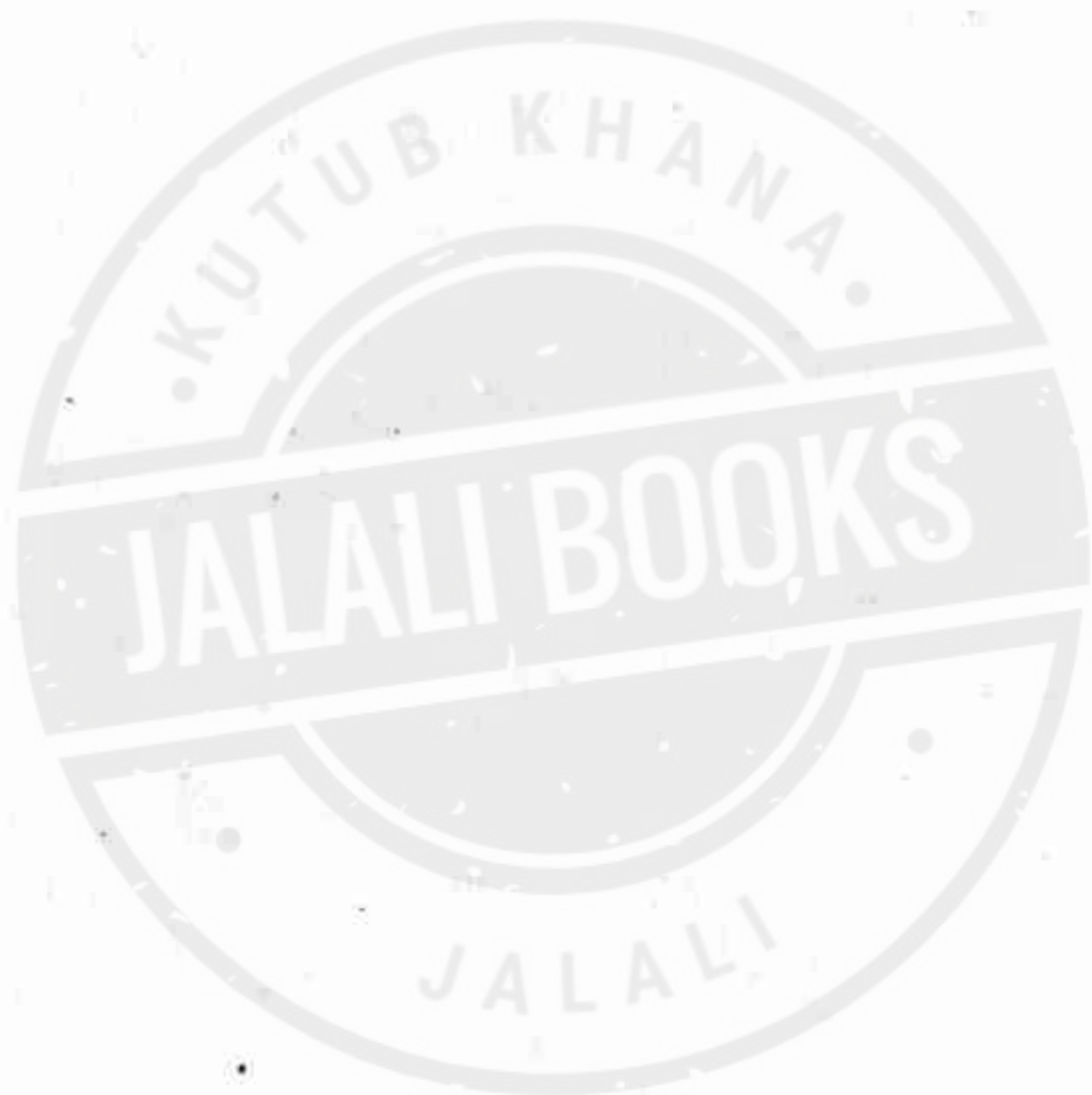
بار اول

فیروز سنز
لاہور پشاور کراچی

فہرس

حرفِ آغاز

اس میں کوئی شک نہیں کہ امن دنیا اور دنیا والوں کے لئے اشد ضروری ہے اور ہر زمانے میں حسب مقدور قیام امن کی مساعی ہوتی رہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنگ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور صرف دنیا میں اسی قوم کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے جو قیام امن کی مساعی میں سرگرم حصہ لیتے ہوئے جنگ کے ہر قسم کے خطرات سے عہدہ بر آ ہونے کی اہلیت رکھتی ہو۔

گزشتہ دو جنگ ہائے عظیم کے حالات ہمارے سامنے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جمعیت الاقوام کا وجود عمل میں آیا۔ جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دنیا کو جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں سے محفوظ رکھ کر دنیا میں صلح و امن کی فضا پیدا کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت صرف اسی وقت تک قائم و برقرار رہ سکتی ہے جب تک متفق علیہ سب اس کے حامی ہوں۔ اگر ان میں سے ایک رکن بھی چاہے تو دنیا کے امن و سکون کو تہ و بالا کر سکتا ہے۔ یہی وہ اسباب تھے کہ جمعیت الاقوام کے ہوتے ہوئے دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور جمعیت الاقوام کا جنازہ نکل گیا۔ اس کی جگہ اب اقوام متحدہ نے لے لی ہے۔ اگرچہ اس کی مساعی امن قابل تعریف ہیں۔ لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی ملک کب اقوام متحدہ سے بغاوت کر کے دنیا کے امن و سکون کو فنا کر کے رکھ دے۔

ان حالات کی روشنی میں ہر اس قوم کے لئے جو دنیا میں ایک باعزت قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کی آرزومند ہے۔ لازم ہے کہ وہ اپنی فوجی طاقت کو اس قدر بڑھائے اور اپنے جوانوں کو جدید آلات حرب سے اس طرح آراستہ کرے کہ کسی کو ان کی طرف

آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہو اور یہ بھی خیال رہے کہ صرف طاقتور قومیں ہی دنیا میں امن وسکون پیدا کر سکتی ہیں۔

اس نہایت اہم ضرورت کو میجر جنرل محمد اکبر خاں صاحب نے زیر نظر کتاب لکھ کر پورا کر دیا ہے۔ قبل ازیں میجر صاحب موصوف کی دو کتابیں "حدیث دفاع" اور "ہمارا دفاع" چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اس سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔
زیر نظر کتاب میں میجر صاحب موصوف نے جدید ترقی یافتہ اسلحہ جنگ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کی اہمیت اور ضرورت پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان جدید ہتھیاروں کے چلانے اور ان کے اثرات سے بھی قاری کو واقف کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

یہ کتاب اگرچہ فوجیوں کے لئے نہایت ضروری ہے لیکن عوام بھی اس کے مطالعہ سے محروم نہیں رہنے چاہئیں۔ کیونکہ آج کی جنگ صرف فوج کی جنگ ہی نہیں رہی بلکہ فوج سے پہلے یہ عوام کی جنگ بن جاتی ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہر فرد ان چیزوں سے واقف ہو جو اس کی تباہی و بربادی کا باعث ہو سکتی ہیں ان سے واقفیت سے ہی وہ اپنے بچاؤ کا بندوبست کر سکتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ میجر صاحب کی یہ قابل تعریف کوشش افواج میں ہی نہیں عوام میں بھی مقبولیت حاصل کرے گی۔ اور عوام اس کے مطالعے سے آنے والے خطرات سے آگاہ ہو سکیں گے۔

ناشران

طاقت کے مقابلہ میں سائنس

کی

جیت

حصول مقصد کے لئے طاقت کا استعمال کب سے شروع ہوا اور جنگ و پیکار وسیلہ کار برآری کب سے بنا اس کی کوئی تاریخ معین نہیں کی جاسکتی۔ جب سے انسان نے دنیا میں آنکھ کھولی۔ اسی وقت سے جہد للبقا شروع ہو گئی۔ خطرات کا مقابلہ؛ درندوں سے حفاظت، شکم پری کے لئے جانوروں کا شکار اور غلبہ کی خواہش۔ انسانی زندگی کے خاص مسائل تھے ۔ ان کے حل کے لئے طاقت کے استعمال کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ جوں جوں آبادی بڑھتی گئی مسائل حیات میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور بقائے زندگی کا سوال افراد کے محدود دائرے سے نکل کر شعوب و قبائل کا اجتماعی مسئلہ بنتا چلا گیا۔ اس دور کا بنیادی مسئلہ خوراک کی فراہمی تھا۔ جسے حل کرنے کے لئے وہ طاقت کا ہر وہ طریقہ کام میں لاتے تھے۔ جس پر انہیں دسترس تھی۔

مثال کے طور پر جب وسط ایشیا کے محدود وسائل معاش آریا کہلانے والوں کی کفالت نہ کر سکے تو وہ وہاں سے چل کر دنیا کے ان تمام ملکوں میں پھیل گئے جہاں انہیں سامان خوراک بافراط مل سکتا تھا۔ اس میں بلاشبہ ان کی قوت و طاقت ہی ان کی ممد ہوتی اور انہیں ان ملکوں کے رہنے والوں پر جو غلبہ و برتری حاصل ہوئی وہ اسی لئے ہوئی کہ ایک طرف تو وہ جسمانی لحاظ سے طاقتور تھے ۔ دوسرے انہوں نے سائنس کی مدد سے دوسری

قوموں کے مقابلہ میں اس طاقت کو اور زیادہ قوی بنا لیا تھا۔ ان کے پاس دھات کے بنے ہوئے ہتھیار تھے۔ ان کے تیروں کے پھل دھات کے بنے ہوئے ہونے کی وجہ سے بہت خطرناک تھے۔ انہوں نے زمین سے زیادہ سے زیادہ خوراک حاصل کرنے کے لئے سائنس کو اپنا مددگار بنا لیا تھا۔ پھر چونکہ خوراک کی فراہمی و حفاظت طاقت کے استعمال پر مبنی تھی۔ اس لئے اس دَور کی سائنس کا استعمال بھی اسی طرف رہا۔ یعنی جو قوم طاقت کی بنا پر لڑائی میں اپنے حریف پر غالب رہتی تھی۔ وہی بہترین و زرخیز ملکوں پر قبضہ کر کے اس کے وسائل خوراک سے متمتع اندوز ہوتی تھی۔

مصر اور عراق عرب (بابل Babylon) کے آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہاں کے قدیم باشندے اپنے زمانہ کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں بہت ترقی یافتہ تھے۔ اہلِ یونان نے انہی کے نقشِ قدم پر چل کر فن حرب، اسلحہ سازی اور قلعہ بندی وغیرہ میں نام پیدا کیا۔

ارشمیدس اور ارسطو نے سائنس کی مدد سے فن سپہ گری کو بہت جلا دی۔ ارسطو سکندر کا استاد تھا۔ اور اگر روایات صحیح ہیں تو سکندر اس کی شاگردی ہی میں رہ کر سکندر اعظم بنا۔ اس زمانے میں ہندوستان فن حرب و اسلحہ سازی میں دوسرے ملکوں سے آگے نہ تھا تو کچھ پیچھے بھی نہ تھا۔ اگر ہندوستان کے بہادر سپاہی دنیا کے فاتحوں میں شمار نہیں ہو سکے تو اس کی وجہ حکمرانوں کی خانہ جنگیاں اور برہمنوں کی ایجاد کردہ فرقہ بندیاں ہیں۔ اشوک کے زمانہ تک یہی حال رہا۔ پھر جب اس نے بدھ مت اختیار کر کے برہمنوں کے اقتدار سے نجات حاصل کی تو بیرونی دنیا نے ہندوستان کے راجپوت سپاہی کا نام سنا۔ اشوک کے بعد محمود غزنوی نے راجپوت سپاہی کی تلوار کی قدر شناسی کی اور روما کی فوج سے اس کا لوہا منوایا۔

دنیا کی تمام آبرومند قوموں اور تمام نامور لوگوں کو اپنے تلوار کے رشتہ پر فخر و ناز رہا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ کامیاب سالار تھے۔ حضرت علیؓ کو اپنے لقب حیدر پر فخر تھا۔ حضرت غالب بھی شاعری کے مقابلہ میں شمشیر زنی اور سپہ گری کو ذریعہ عزت سمجھتے رہے اور جب اُستاد شاہ حضرت ذوقؔ کے ساتھ حریفانہ کشمکش کا معاملہ پیش آیا تو فرمایا ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری   کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

پُرانے وقتوں کا جنگی رتھ
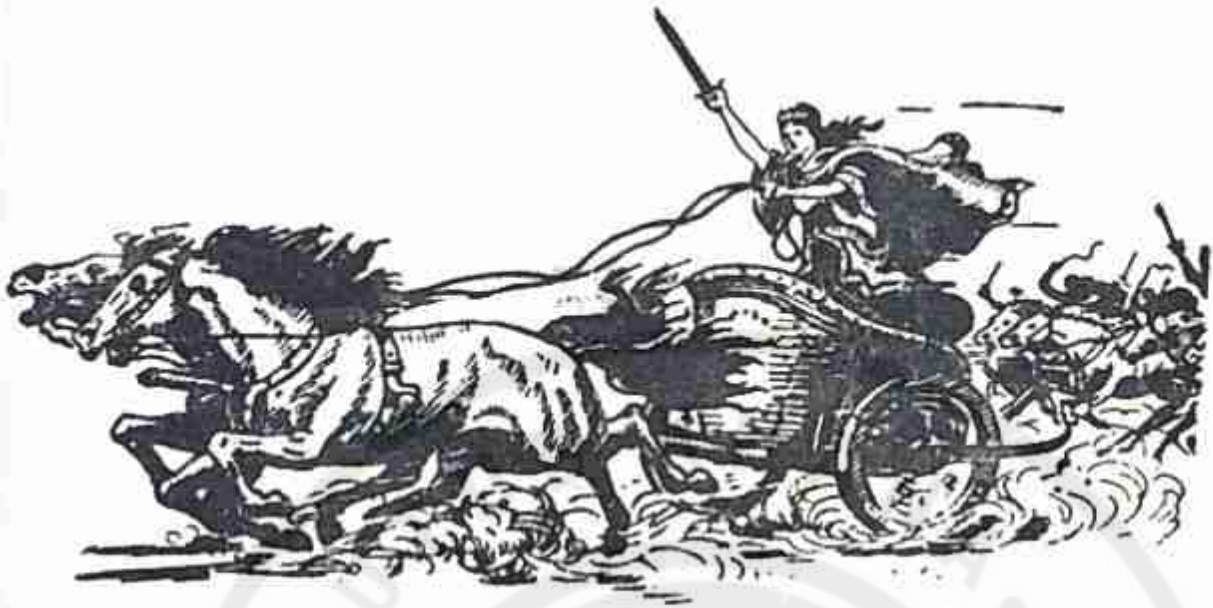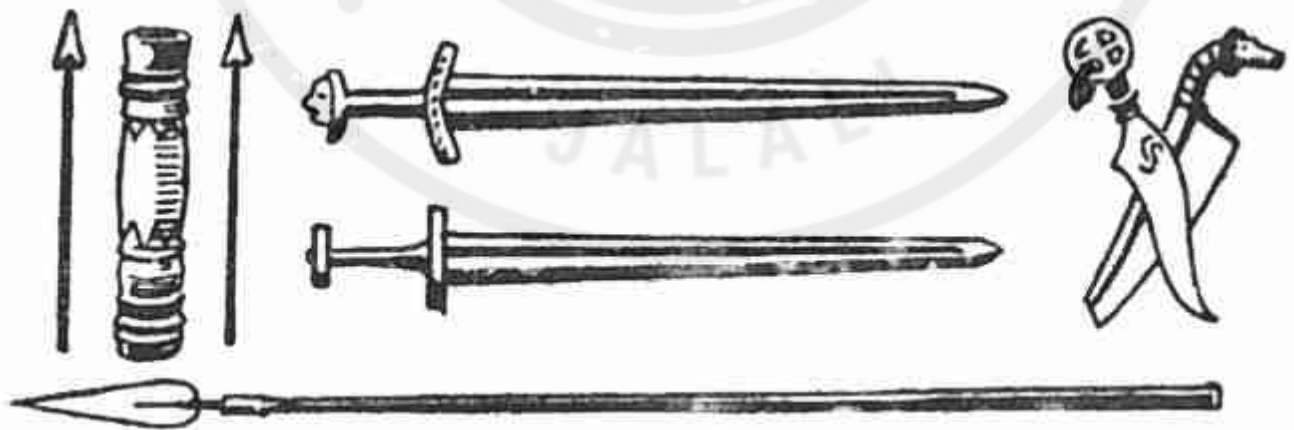
عہد سلف کے جنگی ہتھیار

موجودہ شاعروں میں ابوالاثر حفیظ جالندھری نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں انھیں بھی "تلوار کا سپوت" ہونے پر فخر ہے۔ ہنود پر نظر ڈالیئے تو وہاں بھی شمشیر زنی اور بہادری قابل احترام و ستائش ہے۔ لکشمن اور کرشن نامور سپاہی تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فن سپہ گری میں سائنس کو نہایت کامیابی سے استعمال کیا اور اپنے ساتھیوں کی تھوڑی تعداد سے دشمنوں کے بڑے بڑے لشکروں کو بار بار شکست دی۔ قرآن مجید میں فن حرب و سپہ گری کا بار بار ذکر آیا ہے جس سے اس کی اہمیت واضح اور آشکار ہو جاتی ہے۔

ارسطو نے لڑائی کی سائنس میں کچھ چیزیں لکھی ہوئی چھوڑی ہیں۔ مگر ارشمیدس کی لکھی ہوئی غالباً کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ تاہم ہیرو نے اس کی ایجادوں سے بہت فائدہ اٹھایا اور تین سال تک روما کی فوجوں سے متواتر کامیاب جنگ کی۔ یہ ارشمیدس ہی کا ایجاد کردہ آلہ تھا جس کی مدد سے اس نے روما کے بحری بیڑے پر آتشیں گولے پھینک کر اُسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

ارشمیدس کا یہ آلہ جسے اس زمانہ کی توپ کہنا چاہیئے۔ سنگ باری کا نہایت مؤثر حربہ تھا۔ اس سے دشمنوں پر بڑے بڑے بھاری پتھروں کی بارش کی جا سکتی تھی

قدیم ہندوستان کے لوگوں نے اعلیٰ درجہ کی جنگی رتھیں بنائی تھیں جو بیلوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کی مدد سے چلتی تھیں۔ انہوں نے کئی لڑائیوں میں ہاتھیوں سے وہی کام لیا جو آج کل ٹینکوں سے لیا جاتا ہے۔ مسلح ہاتھیوں کو کبھی دشمن کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لیئے استعمال کیا جاتا تھا کبھی اس کی پیدل فوج اور رسالے کے جمے ہوئے دستوں کو منتشر کرنے کے لیئے۔ ان کی مدد سے دلدلی علاقوں سے فوج کو عبور کیا جاتا اور دریاؤں کو پار کر کے دشمن پر حملہ بھی کیا جاتا۔ یہ ہاتھی ہی تھے۔ جنہوں نے سکندر کی فوج کو بددل کر کے اسے ہندوستان سے واپس جانے پر مجبور کر دیا تھا

اسی جاندار و متحرک ہندی ٹینک یعنی ہاتھی کی تلاش میں محمود غزنوی نے کالنجر پر حملہ کیا تھا اور اسی سے اس نے روما کی سلطنت کو کئی دفعہ شکست فاش دی۔ روما کے سپاہیوں کے پاس اس ہندی ٹینک یعنی ہاتھی کے مقابلہ کرنے کا کوئی حربہ نہ تھا۔ اس لیئے انہوں نے مجبور ہو کر شکست کھائی اور تاریخ میں یہ دوسرا موقعہ تھا کہ ہاتھی

نے مغربی طاقت کو شکست دی۔
جب تک میدان جنگ میں جسمانی طاقت اور تحمل و برداشت کا سکہ چلتا رہا اور اہل ایشیا سائنس سے مدد لیتے رہے وہ بہادر اور نام آور رہے۔ چنگیز خاں کی تباہ کاریوں اور فتحمندیوں کا راز بھی یہی تھا کہ اس نے قوت و طاقت کے ساتھ سائنس کو اپنا رہنما بنایا۔ اور اسی وجہ سے وہ ایشیا سے اٹھ کر یورپ تک تلاطم برپا کرتا ہوا چلا گیا۔

لیکن اب پانسہ پلٹتا ہے اور سائنس کی کارگاہ عمل ایشیا سے یورپ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اہل یورپ دھاتوں کے استعمال میں سائنس سے مدد لیتے ہیں اور ایشیائی حملہ آوروں کی تاخت کے سدّباب کا بندوبست کرتے ہیں۔ وہ مختلف دھاتوں کی ملاوٹ میں کامیاب ہو کر زرہ بکتر بناتے ہیں۔ جس کے بعد ہر ملک کے سپاہی یورپ کے نمائندوں کے مقابلہ پر آنے سے گھبراتے ہیں۔ اپنی فوجی اغراض و ضروریات کی تکمیل کے لئے حکومتوں نے بھی سائنس سے مدد لی۔ عمدہ اور پختہ سڑکیں تعمیر کی گئیں تاکہ فوجوں کی نقل و حرکت میں دشواری نہ ہو۔ اسی طرح دریاؤں پر پل اور سرحدوں پر قلعے بنائے گئے۔ اور مورچہ بندیاں کی گئیں۔ سڑکوں کی تعمیر کے بعد ذرائع نقل و حرکت کا مسئلہ زیر غور آیا۔ سائنسدان آگے بڑھے اور انہوں نے بھاپ کی قوت دریافت کی اور ایک فرانسیسی ماہر سائنس نے ایسا رتھ بنایا جو بھاپ کی مدد سے چلتا تھا۔ چونکہ یہ پہلی ایجاد تھی۔ اس لئے اس کی رفتار قابل اطمینان نہ تھی۔ اس لئے حکومت فرانس نے شست روی کی وجہ سے اُسے رد کر دیا۔ لیکن برطانیہ والوں نے اسے اپنا لیا اور ریل کا انجن تیار کر کے اس سے کام لینے لگے جو کچھ عرصہ بعد امن و جنگ دونوں میں نہایت مفید و کارآمد ثابت ہوا۔

فرانس کے سائنسدانوں کی توجہ بدستور فوج کی ترقی اور آلات جنگ کی ایجاد پر رہی۔ چنانچہ یورپ کے جنگی میدانوں میں بارود کا استعمال انہی کی کوششوں کا رہین منت ہے۔

پنولین غالباً یورپ کا پہلا سپہ سالار ہے۔ جس نے باقاعدہ طور پر سائنسدانوں کی مدد حاصل کی۔ چونکہ فرانس کے سائنسدان اپنے ملک اور فوج کے بڑے حامی و مددگار تھے۔ اس لئے فرانسیسی سپاہیوں کو بھی سائنس سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔

میدان جنگ میں بارود کے استعمال سے دھاتوں کی آمیزش کی ایجاد کو بہت فروغ ہوا اور ایسی بندوقیں اور توپیں بننے لگیں۔ جن سے گولیاں اور گولے چلاتے وقت
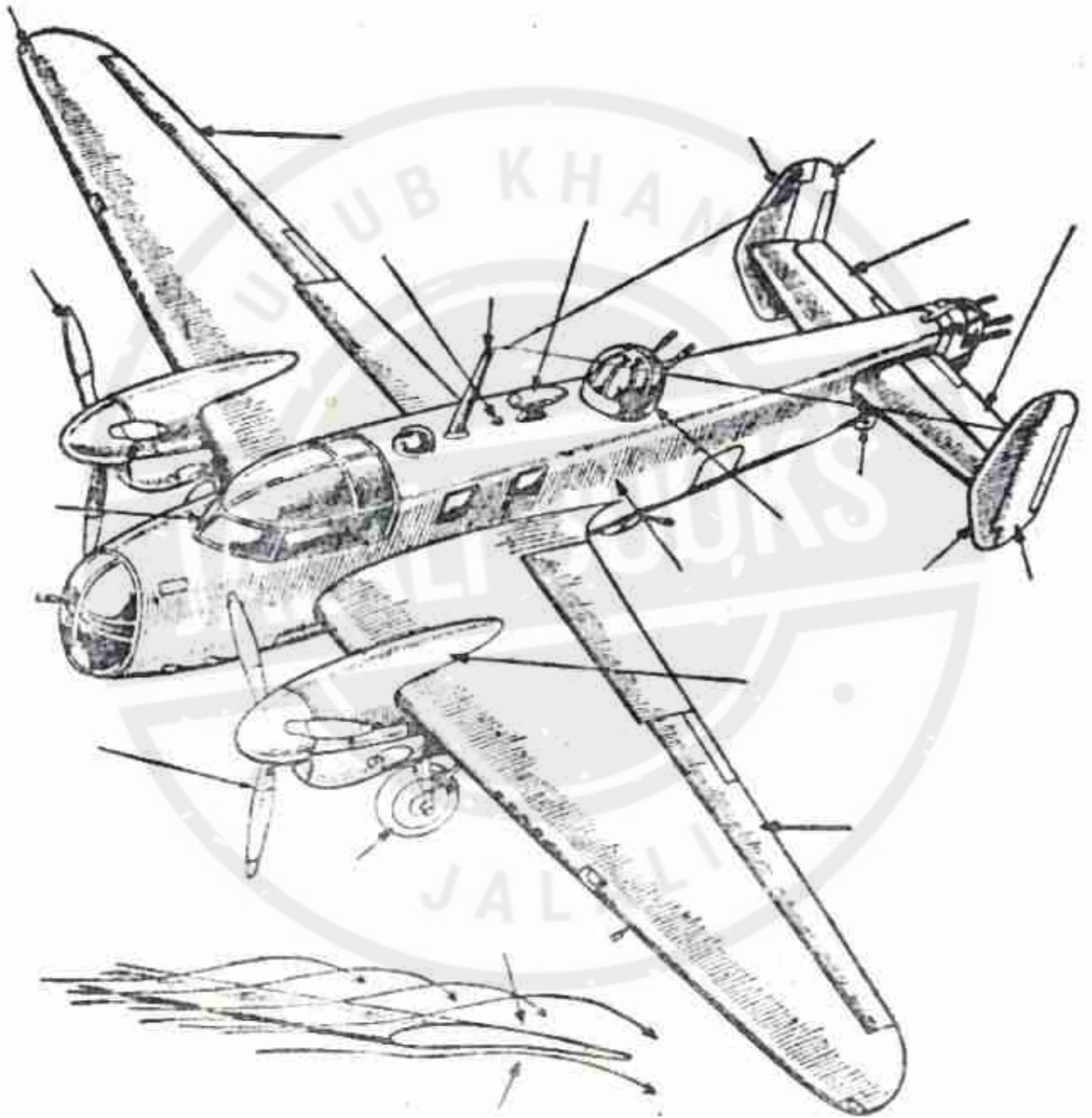
جٹ طیارہ

ان اسلحہ کے چلانے والے سپاہیوں کی جانیں خطرہ سے محفوظ ہوگئیں۔

اسلحہ سازی میں دھاتوں کے استعمال کے علاوہ ٹرانسپورٹ یعنی بار برداری کی گاڑیاں وغیرہ بنانے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر جب سائنس نے پٹرول، گیس اور بجلی کا استعمال ممکن بنا دیا تو یہی دھاتیں موٹریں، ہوائی جہازوں اور بحری جہاز۔ وغیرہ بنانے میں کام آنے لگیں۔

ان ایجادوں میں جرمن سائینسدانوں کا حصّہ بہت بڑا ہے۔ مثال کے طور پر جرمن سائینسدانوں نے بارود میں نائٹروجن ملا کر اسے بہت زیادہ خوفناک بنا دیا ۱۹۱۴ء سے پہلے قیصر ولیم کالج اس کام میں بے مثال تھا۔ قیصر کے دست بردار ہونے کے بعد جمہوری حکومت بھی اس کی سرپرستی کرتی رہی۔ جرمنوں نے ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ میں جو گیس استعمال کی وہ ان ہی سائینسدانوں کی ایجاد کردہ تھی۔ ۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ میں جرمنوں کی ایک خاص ایجاد V2 بم تھی۔ ایٹمی بم کی ایجاد کو وہ مکمل نہ کرسکے

اس قسم کی جنگی ضرورتوں کو پورا کرنے کی وجہ سے تین قسم کی صنعتوں کو خاص طور سے فروغ ہوا۔ ان میں سے ایک دھاتوں کی صنعت ہے۔ دوسری کیمیائی صنعت اور تیسری ہوائی جہازوں کی صنعت۔ ان کے متعلق یہ کہنا کہ کون سی دفاعی نقطۂ نظر سے باقی دو پر فوقیت رکھتی ہے۔ بہت مشکل ہے۔

ہوائی جہازوں کی صنعت میں تھوڑے سے عرصہ کے اندر اتنی ترقی ہوئی ہے کہ چند سال پہلے اس ترقی اور اتنی نت نئی ایجادوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شروع کی ایجادوں میں پٹرول کا استعمال خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پھر ڈیزل آئیل مقبول ہوا اس کے بعد جب جٹ (Jet) ایجاد ہوا تو یہ دونوں چیزیں پس پشت پڑ گئیں۔ جٹ کی ایجاد کے ساتھ دفاعی ایجادوں کا سلسلہ بھی جاری رہا مثلاً ۱۹۳۹-۴۰ء میں جب جرمنی کے بمباروں نے برطانیہ کو تاراج کرنا شروع کیا تو انگریزوں نے راڈر ایجاد کیا۔ جسے ابتداء میں حملہ آور ہوائی جہازوں کی سمت معلوم کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد تجربہ نے۔ یو بوٹ (U. Boat) کے خطرہ سے حفاظت کے لئے کام میں لانا شروع کیا۔

جٹ کی ایجاد کو اگر اتحادیوں نے ہوائی جہازوں اور ان سے گولہ باری کرنے

بیں استعمال کیا تو جرمنی نے اس سے V1 اور V2 میں کام لیا۔ انجینئر ہمیشہ سے فوج کے معاون رہے ہیں اور ان کی ایجادیں سائینسدانوں کے علم و ہدایت کے ماتحت رہی ہیں۔ یعنی انہوں نے میدان جنگ میں استعمال کے وہ سامان تیار کئے جن کی تیاری کے امکان کا سائینسدانوں نے اعلان کیا۔ گویا سائینسدانوں نے نظریہ یا اصول (Theory) پیش کیا اور انہوں نے اس پر عمل کر کے اور وہ چیز بنا کر پیش کر دی۔ مثال کے طور پر (Spectroscope) کو لیجئے۔ اس آلہ کی مدد سے کئی کئی ہزار ٹن لوہا ریل گاڑیوں پر لدا لدایا پرکھا جا سکتا ہے۔ ایجاد میں اصولی و نظری اعتبار سے اولیت کا سہرا سائنسدانوں کے سر ہے۔ مگر تکمیل و تیاری کا انجینئروں کے سر ہے۔ پہلے اتنے لوہے کے پرکھنے میں کئی کئی ہفتے لگ جاتے تھے۔ لیکن اب اس کام میں صرف چند گھنٹے لگتے ہیں۔ اسی طرح دوسری دھاتوں کی آمیزش کو بھی اس سے پرکھا جا سکتا ہے کہ آمیزہ میں تمام دھاتیں مقررہ مقدار میں ملائی گئی ہیں یا نہیں۔ مثلاً توپ کے گولوں کے خول کو لیجئے۔ پہلے ان کو توڑ کر امتحان کئے بغیر آمیزش کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ لیکن اب اس آلہ کی مدد سے بغیر توڑے سالم خولوں کو دیکھ کر بتایا جا سکتا ہے کہ اس میں تمام دھاتیں مناسب مقدار میں ملائی گئی ہیں یا نہیں۔

اس تفصیل سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمارا مقصد سائینس اور دفاعی ضروریات کے اتحاد اور انحصار باہمی کا دکھانا ہے۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ سائینسدانوں نے فن حرب کے اصولوں کو کس طرح بدلا ہے اور ان دونوں کے تعاون کا دفاع کی ترتیب پر کیا اثر پڑا ہے۔

جہاں تک دفاعی سیاست کے اصول کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے اٹل ہیں اور ہمیشہ اٹل رہیں گے۔ لیکن ان کے استعمال کے طریقے بدلتے رہیں گے۔ یہ کوئی انفرادی نظریہ نہیں۔ بلکہ اس پر مشرق و مغرب کے تمام دفاعی مبصرین متفق ہیں۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ فن حرب میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ صنعتی ترقی کے زیر اثر ہوئی ہیں یا فوج کی نئی ترتیب و تنظیم (Organisation) کی وجہ سے۔ تدریج تعیلم اس تغیر کا سبب ہے یا موٹر سے متحرک ہونے والے ذرائع بار برداری (Mechanical invention) جن میں گاڑیاں وغیرہ بحری اور ہوائی جہاز وغیرہ سب شامل ہیں اور جن کے استعمال نے اصول حرب میں زبردست انقلاب پیدا کر

دیا ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ کسی ملک کی فوج اس وقت تک حریف طاقت سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کے پاس نقل وحمل کے ذرائع کافی اور قابلِ اعتماد نہ ہوں چونکہ آج کل ہر ملک میں عمدہ سڑکیں موجود ہیں اور انجینئروں کی مدد سے دلدلوں اور ریگستانوں میں بہت تھوڑی مدت میں عمدہ سڑکیں، ریل کی پٹریاں اور ہوائی جہازوں کے اڈے اور پل بنائے جا سکتے ہیں۔ اس لئے بڑی بڑی فوجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں پٹرول اور جٹ کے استعمال سے اور بھی آسانیاں ہو گئی ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ نپولین کا یہ مقولہ کہ "فوج بلا خوراک نہیں لڑ سکتی" کوئی نیا مقولہ نہیں ہے۔ ارسطو نے اچھے سالار کی خصوصیتوں میں سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا اور یہ کہا ہے کہ سپہ سالار کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ فوج کے پاس سامان رسد اور ہر سامان حرب کافی ہے یا نہیں اور اس میں جنگ سے پیدا ہونے والی روزانہ کمی کو کیسے اور کہاں سے پورا کیا جائے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوات میں ہمیشہ اس کو بڑی اہمیت دی۔ آج کل چونکہ فوجیں بڑی تعداد میں ہوتی ہیں اور ان کی رسد اور گولے بارود کا خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے باربرداری کی بہت ضرورت ہے اور چونکہ باربرداری کے بری بحری اور فضائی ذرائع نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس لئے حکومتوں کے لئے اندرون ملک سے میدان جنگ کو اس قسم کے تمام سامان کا پہنچانا ہی آسان نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے ایک براعظم سے دوسرے براعظم کو بھی آسانی سے پہنچا سکتی ہیں۔ لہٰذا اس زمانہ میں لق و دق صحراؤں اور جنگلوں وغیرہ میں کسی جگہ لڑنے میں وہ دشواریاں نہیں ہیں جو پہلے تھیں اور جن کی وجہ سے فوجیں غیر متحرک بن جاتی تھیں۔

تیسری بات یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ آج کل کی لڑائیاں غارتگری و تباہ کاری کے لحاظ سے انتہائی ہولناک ہیں۔ تیر و تفنگ اور بھالے تلوار کی جگہ دہشتناک بموں اور گولوں نے لے لی ہے۔ پھر وہ زمینی آلات الگ ہیں۔ جن میں توپیں، مشین گنیں۔ ٹرینچ ماٹر وغیرہ شامل ہیں۔ طیاروں سے۔ جن میں بغیر ہوا باز کے چلنے والے طیارے بھی شامل ہیں۔ میدان جنگ ہی میں نہیں۔ دشمن کے شہروں اور شہریوں پر بم اور گولے برسائے

جاتے ہیں۔ اس میں نہ دن کی قید ہوتی ہے نہ رات کی۔ جو کام پہلے بری یا بحری سفر سے ہفتوں میں نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ طیاروں کی مدد سے گھنٹوں میں ہو جاتا ہے۔

چوتھے آج کل کی دنیا دو بڑی جماعتوں میں تقسیم ہو گئی ہے تیسری جماعت جسے غیر جانبدار کہنا چاہیئے۔ بہت چھوٹی اور بڑی حد تک بے اثر ہے۔ لہذا وہ کسی شمار میں نہیں آتی۔ ان بڑی مخالف جماعتوں نے ایک دوسرے سے نبرد آزمائی کی تیاریاں بڑے پیمانہ پر کی ہیں۔ پچھلی عالمی لڑائیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف لڑنے کی غرض سے نہ لڑی گئی تھیں، بلکہ مقررہ عہد ناموں اور طریقوں کے ماتحت لڑی گئی تھیں، مختلف اتحادیوں نے اپنے اپنے خاص منصوبے بنائے تھے اور ان کا باہمی تعاون ان کے اپنے مقررہ اصولوں پر مبنی تھا۔

پانچویں، سائینسدانوں نے پچھلی عالمی لڑائیوں میں بہت نمایاں حصہ لیا اور انجینئر ان کی اختراعات کو حقیقی صورت میں میدان جنگ میں لاتے رہے۔ بے تار برقی جنٹ کی طاقت اور گیس جو مختلف خوفناک شکلیں اختیار کر کے ظاہر ہوئی مثلاً کہیں بر اشک آور بن کر سامنے آئی کہیں زہریلی، کہیں جراثیمی تھی۔ کہیں جسم کو جلا دینے والی۔ دوسری عالمی جنگ کے آخر میں ایٹم بم ایجاد ہوا اور اب سائینسدان ہائیڈروجن بم بنا رہے ہیں۔ موت کی برقی لہر (Death ray) ایجاد ہو چکی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انجینئر اسے میدان میں کب لاتے ہیں۔

چھٹی اور آخری بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ آج کل غیر مصافی شہریوں کو دشمن کی مباری کا اتنا ہی خطرہ ہے جتنا کہ فوجوں کو اور پچھلی دونوں بڑی لڑائیوں کے تجربات اس کی زندہ شہادت ہیں۔

لہذا آج کل کی دفاعی سیاست اور فن حرب یعنی (Military Science) کو علم دفاع کے نام سے پکارنا چاہیئے اور اس کا مطالعہ ارباب حکومت اور اراکین دفاع ہی کو نہیں۔ عوام کو بھی پوری توجہ سے کرنا چاہیئے۔ علم دفاع کے مطالعہ کے بغیر کوئی حکومت جو عوام کی نمائندہ اور انتخاب کردہ ہو۔ ملک کے دفاع کا صحیح طور پر بندوبست نہیں کر سکتی۔

چھوٹے ہتھیار

امریکہ کے فوجی ماہر ڈبلو ایچ بی اسمتھ (W. H. B. Smith) نے "فوج کے چھوٹے ہتھیار" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "جب پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی تو ہمارے پاس نہایت اعلیٰ درجہ کے ہتھیار تھے جو باوجودیکہ مشینوں سے ایک ہی بار بنے تھے پھر بھی نہایت مضبوط عمدہ اور کارآمد تھے۔ مگر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو اس کا آغاز ہم نے بھدی ساخت کے ان بھدے ہتھیاروں سے کیا جو پہلی جنگ میں ناکارہ ثابت ہو چکے تھے۔ اس طرح گویا ہم نے اسلحہ کی ساخت و ایجاد اور کارآمد ہتھیار بنانے کے مسئلہ پر امن کے زمانہ میں بہت کم توجہ دی......!

جرمنی نے دوسری عالمی جنگ کے دوران میں اور اس کے اختتام کے قریب اس قسم کے ہتھیاروں کی ساخت میں بہت ترقی کی، اور جرمنی و جاپان نے اپنی ہنرمندی سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ ہتھیار معمولی قسم کی مشینوں سے بہت کم محنت اور سستے سامان یعنی بیکار لوہے وغیرہ (Alloy Casting) سے تیار ہو سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے ان کو چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں بنایا تاکہ لاگت بھی کم آئے اور چھوٹے چھوٹے کاریگر اس صنعت سے فائدہ بھی اٹھا سکیں "

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ جنوبی امریکہ میں ملک کے تحفظ اور شکار کے لئے ان ہتھیاروں کی بہت ضرورت ہے۔ لہذا کیوں نہ وہ جرمن جو وہاں آباد ہو گئے ہیں۔ اس قسم کے ہتھیاروں کی ساخت کا کام شروع کر دیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ وہاں ان پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے اور پھر شکار ہی کے ہتھیار کیوں بنائیں۔ جنگ کے ہتھیار کیوں

نہ بنائیں۔

کیا ہماری حکومت اور ہماری اسلحہ ساز کمپنیاں اس پر غور کر رہی ہیں اور کیا وہ جنوبی امریکہ کی ضرورت پورا کرنے کے معاملہ پر کماحقہٗ توجہ دے رہی ہیں ؟ روس نے فوجی تربیت اور افسر کلاس کا اضافہ کر کے ہتھیار سازی کے اس فن میں بڑی نمایاں ترقی کی ہے اور اب وہ نئے اور پائیدار قسم کے ہتھیار تیار کر رہا ہے۔ روسی اسلحہ کی ساخت بہت سادہ ہے۔ انہوں نے اپنے ہتھیاروں میں بہت آسان پرزے لگائے ہیں تاکہ چلانے میں سہولت اور آسانی ہو اور موٹی سی موٹی عقل کا آدمی بھی انہیں موثر طریق پر استعمال کر سکے۔ روس پیچیدہ اور دشوار کل پرزے بنانے کے خلاف ہیں۔ پھر ایک فائدہ یہ ہے کہ ایسے ہتھیاروں کی نگہداشت آسان ہے چونکہ زیلا مہلس (Zella Mehliis) کی مشہور جرمن فیکٹری اور (Czech) قوم کی مشہور فیکٹریاں جو پراگ (Prague) اور برونو (Bruno) میں ہیں۔ اس لئے عجب نہیں کہ اب وہ ان کی ساخت و تکمیل کو وہاں کے ماہرین اسلحہ کی مدد سے اتنا عمدہ بنا لیں کہ زمانہ امن کی عالمی تجارتِ اسلحہ ان کے ہاتھ میں چلی جائے۔

امریکی اسلحہ ساز کمپنیوں کے متعلق ہماری بے لاگ رائے یہ ہے کہ وہ ساخت کے معاملہ میں بہت قدامت پسند ہیں۔ لیکن یہ بھی ناممکن ہے کہ حکومت کی نمایاں امداد کے بغیر انہیں نئی ایجادوں سے کافی دلچسپی پیدا ہو سکے۔ کیونکہ نئی ایجادوں کے لئے ان کاروباری کمپنیوں کو اپنے ماہروں اور کاریگروں کو بڑی اجرت دینی پڑتی ہے۔ اور یہ مالی بار حکومت کی مالی امداد کے بغیر برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ہتھیاروں کی ساخت کی ترقی قومی مفاد کا معاملہ بن جائے تو اسلحہ ساز فیکٹریاں نئی قسم کے متعدد ہتھیار بنا کر فوج کو آزمایش کے لئے دے سکتی ہیں۔ اس کے بعد انہیں فوجی آرڈیننس (Ordnance) کے ماہروں کو معائنہ کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ فوجی ماہرین میدان جنگ کے تجربہ کی بنا پر صحیح مشورہ دے سکیں اس طرح ملک میں نہ صرف نئی ایجادیں ہوں گی۔ بلکہ تمام ملک میں چھوٹی چھوٹی کمپنیاں موجود ہیں آ جائیں گی۔ چھوٹے سرمایہ دار اور کاریگر مصروف رہیں گے۔ اور لڑائی کے زمانہ میں جانوں کی حفاظت آسان ہو گی۔ اور اگر ہتھیاروں کی ساخت کا منصوبہ عقلمندی اور دور اندیشی سے تیار کیا جائے گا۔ تو یہ فیکٹریاں تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہونے

کی وجہ سے ملک کے دفاع کے لیئے بڑی مفید ثابت ہوں گی اور نئی جنگ چھڑنے پر ہم پہلے کی طرح نہتے نہیں رہیں گے۔ بلکہ ہم میں ایک نیا ولولہ عزم اور جرأت ہو گی۔
جس طرح کسی شہر کا انتظام، پولیس اور آگ بجھانے والے محکمہ کے بغیر نہیں ہو سکتا خواہ یہ محکمے نالائق، رشوت خور اور نا اہل ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح موجودہ پرآشوب دَور میں بغیر ہتھیاروں کی ساخت، نئی ایجادوں اور ماہرین کی فن کارانہ اختراعات کے ملک کی حکومت وحفاظت کا کام نہیں چل سکتا۔ ایسے حالات میں اگر جنگ میں شمولیت کا فیصلہ کیا جائے گا تو آپ کی فوج دشمن کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور اس ناکامی کا ذمہ وار کسی طرح فوج کو نہیں ٹھہرایا جا سکے گا۔ مثال کے طور پر اگر آپ نے فوج کو خراب قسم کے ٹینک، معمولی قسم کی توپیں اور مشین گنیں وغیرہ دی ہیں تو موردِ الزام آپ ہیں نہ کہ فوج۔ اور یہ ملک کی بدقسمتی ہوگی۔ اسے زمانہ جنگ کی قسمت پر کہہ سکتے ہیں۔ مگر ایسی تقدیر کہ جس میں تدبیر کا دخل نہیں۔ کیونکہ تدبیر کا تقاضا یہ ہے کہ ہم دور اندیشی سے کام لیں اور امن کے زمانہ میں اس قسم کی نئی ایجادوں کا سلسلہ جاری رکھیں اور فوج کے ہتھیاروں کا بہتر معیار قائم رکھنے کے لیئے اسلحہ کی ساخت وایجاد کے منصوبوں پر عمل کریں۔ اس معیار کو اعلےٰ پیمانہ پر قائم رکھنے کے لیئے ضروری ہے کہ سائینسدانوں، تجارت پیشہ لوگوں، اور فوجی مبصرین میں باہم پورا پورا تعاون ہو اور مقصد مشترک قوم کا عمومی مفاد، نیز یہ نظریہ کہ کیا یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے ہتھیار ساری دنیا میں بہترین ہیں۔ اور کیا ہم تھوڑی مدت میں جلد سے جلد، مگر زیادہ سے زیادہ تعداد میں انہیں تیار کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔"

یہ مشورہ امریکہ کے ایک فوجی ماہر نے اپنے اہل ملک کو دیا ہے۔ پاکستان کو بھی اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ اس کے لیئے یہ مشورہ، اور یہ طریق کار کتنا اہم ہے۔ بہر حال ہم یہاں اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ارباب علم وبصیرت پر اس کی اہمیت پوری طرح واضح ہے۔

چھوٹے ہتھیاروں میں شمار ہونے والے آلات حرب کون کون سے ہیں۔
ان کو آگے چل ہم تصویروں سے واضح کریں گے اور ان کے طریق استعمال پر اپنا ذاتی تبصرہ بھی پیش کریں گے۔ ممکن ہے اس معاملہ میں بعض صاحبوں کو

ہم سے اتفاق نہ ہو۔ مگر ہم ان کے مشورہ اور نکتہ چینی کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہیں گے۔

بہر نوع چھوٹے قسم کے ہتھیاروں کی ساخت کے سلسلے میں سب سے پہلے برطانیہ نے قدم اٹھایا۔ ۱۶۳۷ء میں انگلستان کے بادشاہ چارلس اول نے لندن کے چند بندوق ساز کاریگروں کو ایک سند عطا کی۔ جس میں لکھا کہ فلاں فلاں کاریگروں نے شاہی فوج اور عوام کے لئے ایسے ہتھیار بنائے جو نہایت عمدہ اور پائیدار ثابت ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ کاریگر بہت ماہر ہیں اور عام لوہار اور معمولی قسم کے بندوق ساز نہ صرف اس صنعت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ بلکہ بادشاہ کی رعایا کے ہاتھوں ردی قسم کے ہتھیار فروخت کر رہے ہیں۔ لہذا بندوق سازوں کی اس کمپنی (Worshipful Company of Gunmakers) کو بندوق سازی کا فرمان عطا کیا گیا۔ ان بندوق سازوں کی تعداد ۶۳ تھی۔ اس کمپنی کو اختیار دیا گیا کہ برطانیہ کے تمام بندوق سازوں کے بنائے ہوئے ہتھیاروں کا معائنہ کرے اور دیکھے کہ تیاری کے بعد ان کی ساخت پائیداری اور شکل وصورت کے اعتبار سے اطمینان بخش ہے یا نہیں۔ ان کے علاوہ وہ ان تمام اسلحہ کا بھی معائنہ کریں جو سلطنت برطانیہ میں شاہی فوج یا عوام کے استعمال کے لئے باہر سے آئیں۔ اس قسم کے اسلحہ کے تمام تاجروں کو اپنا مال اپنے خرچ پر کمپنی کے معائنہ کے لئے لندن لے جانا پڑتا تھا۔ جو لوگ خلاف ورزی کرتے سزا کے مستوجب قرار پاتے۔ اسلحہ میں ان کے چھوٹے چھوٹے پرزے بھی شامل تھے۔ معائنہ کے بعد ان سب پرزوں پر مہر لگائی جاتی تھی۔ یہ کام اب تک جاری ہے۔ ۱۶۷۰ء میں یہی سند "دی گارڈین آف دی پروف ہاؤس" کو عطا کی گئی۔ اس طرح لندن کے کاریگروں کو نہ صرف اپنے ملک کے کاریگروں کی صنعت اور اس کے معیار ترقی کا اندازہ رہتا۔ بلکہ وہ دوسرے ملکوں کے اسلحہ سازوں کے صنعتی رازوں سے بھی واقف ہو جاتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے۔

برطانیہ کے بعد بیلجیم نے اس کی نقل کی اور ۱۶۷۲ء میں اس نے بھی معائنہ و امتحان کے بعد مہر لگانے کا قانون بنایا۔ مگر وہ برطانیہ کی طرح اپنے معیار کو بلند نہ کر سکا۔

۱۸۹۲ء میں جرمنی نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور اس کے ساتھ ہی بلجیم کے بنائے ہوئے اسلحہ اور اس کی مہر کو اپنے ملک میں ناقابلِ قبول قرار دے دیا۔ اس سے بلجیم کے کاریگروں کو بہت نقصان پہنچا۔ کیونکہ اس وقت تک جرمنی کو تقریباً تمام ہتھیار بلجیم ہی مہیا کرتا تھا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ یورپ کے دوسرے ملکوں اور امریکہ نے بھی معائنہ و مہر کے طریقہ کو اختیار کیا۔ معائنہ کا طریقہ سمجھنے کے لئے برطانیہ کی مثال کو لیجئے۔

جب کوئی ہتھیار خواہ وہ اندرون ملک کسی کمپنی کا بنایا ہوا ہو یا۔ بیرون ملک کا درآمد شدہ اس ملک میں سرکاری یا غیر سرکاری استعمال کے لئے آتا ہے تو اسے "پروف (Proof) لگانے کے محکمے یا کمپنی کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر وہاں اس پر حرف 'V' کی مہر ثبت کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اور اسکے پرزوں کی ساخت و حرکت اطمینان بخش ہے۔ اس کے بعد اگر وہ بندوق ہے۔ تو اس کے نال کی ساخت اور پائیداری وغیرہ کا معائنہ کیا جاتا ہے اور اس کی نال میں عام کارتوس کی مقدار سے کہیں زیادہ بارود بھر کر چلایا جاتا ہے تاکہ اس کی مضبوطی کی آزمائش ہوجائے۔ اگر یہ آزمائش پوری ہوجاتی ہے تو اس پر V.P. کی مہر لگائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ہتھیار ہر اعتبار سے تسلی بخش ہے۔ یہ برطانیہ کا طریقہ ہے۔ دوسرے ملکوں میں بھی کم و بیش یہی طریقہ رائج ہے۔ مگر ان کی مہروں کے الفاظ یا نشانات دوسرے ہوتے ہیں۔

جب جرمنی میں ہٹلر برسرِ اقتدار آیا تو اس نے بڑے بڑے کارخانوں میں صرف بھاری اسلحہ تیار کرنا شروع کیا اور چھوٹے اسلحہ کی ساخت و تیاری کا کام چھوٹی چھوٹی کمپنیوں کے سپرد کر دیا۔ البتہ تیاری اور تکمیل کے بعد معائنہ حکومت کرتی تھی۔ اس طرح جرمنی میں بے شمار ہتھیار بننے لگے۔ جو سستے بھی ہوتے تھے اور معیار کے اعتبار سے بہتر بھی۔ پھر یہ معیار روز بروز اور بہتر ہوتا گیا۔ بہت سے لوگوں کو اس صنعت سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور اس کو انہوں نے نفع بخش ذریعہ معاش کے طور پر اختیار کر لیا۔ دوسری عالمی جنگ میں اتحادیوں نے جرمنی کے صنعتی مرکزوں پر شدید بمباری کی۔ مگر یہ چھوٹے چھوٹے کارخانے محفوظ رہے اور اپنا کام برابر کرتے رہے۔ جرمنی کی طرح جاپان میں بھی اس طریقہ پر عرصہ سے عمل کیا جا

رہا تھا۔ اس کے چھوٹے اسلحہ کا ہلکا پن اور کم قیمتی مشہور ہے۔ روس میں بھی اسلحہ سازی کا یہی طریقہ ہے اور یہی دوسری عالمی جنگ میں اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔ جس وقت جرمنی نے اس کے بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ تو اس کے چھوٹے چھوٹے کارخانے اور کاریگر۔ اپنی محنت وہنرمندی سے برابر اسلحہ تیار کر کے روسی جانبازوں کو مہیا کرتے رہے۔ تاآنکہ اس کی سرزمین وطن جرمن حملہ آوروں کے وجود سے پاک ہو گئی۔ پارکر او ایکلے (Parker O. Ackley) امریکہ کا مشہور ماہر اسلحہ ساز ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس نے امریکہ کے اور دوسرے ملکوں کے چھوٹے ہتھیاروں کا نہایت غائر مطالعہ کر کے اپنی حکومت کے سامنے رپورٹ پیش کی تھی جو بعض اعتبارات سے نہایت انکشاف انگیز ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جاپانی ساخت کا (Arisaka 6 m.m.) فوجی نقطۂ نظر سے نہایت پائیدار اور اپنی قسم کے ہتھیاروں میں دنیا کا بہترین ہتھیار ہے۔ حالانکہ جاپان کے دوسرے ہتھیار بڑے مضحکہ خیز تھے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر جرمنی کی ماؤزر رائفل ہے (Mauser) اور تیسرے نمبر پر امریکہ کا ۱۹۱۷ء کا ماڈل (Enfield) ہے۔ چوتھے نمبر پر (Spring field) اور آخری نمبر پر برطانیہ کی رائفل (Enfield) اور بارود کے دھماکے کے اثرات مختلف پرزوں کی نقل و حرکت، ان کی پائیداری، خصوصی طور سے۔ بولٹ کی مضبوطی اور گولی چلانے کے متعلق ٹسٹ رائفل کی پائیداری کا فیصلہ ہے۔ روس کی رائفل بھی اس امتحان میں اچھی ثابت ہوئی اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جن ملکوں میں چھوٹی فیکٹریوں سے کام لیا جاتا ہے وہ کامیاب رہے۔

اگر پاکستان میں لاہور، گوجرانوالہ، وزیر آباد، کوٹلی لوہاراں اور پشاور وکوہاٹ وغیرہ کے کاریگروں کی ہمت افزائی کی جائے اور انہیں منظم کر کے ایک قانون کے ماتحت اپنی ہنرمندیوں کو قومی مفاد کی خاطر بروئے کار لانے کا موقع دیا جائے تو ایک اہم ترین صنعت جلد فروغ پا سکتی ہے۔ ہمارے یہاں ہوشیار کاریگروں کی کمی نہیں۔ مگر افلاس وکس مپرسی نے انہیں معذور ومجبور بنا رکھا ہے۔ اگر انہیں مالی مدد دی جائے ان کے ہنر کی قدر کی جائے۔ انہیں دوسرے ملکوں کے تیار کردہ ہتھیاروں کے نقشے اور مقررہ جگہ پر ہتھیار مہیا کئے جائیں تو چھوٹے اسلحہ کی صنعت یہاں بھی اتنی ہی ترقی

کرسکتی ہے۔ جتنی دوسرے ملکوں میں کر چکی ہے اور سرکاری نظم و نگرانی اور پروف کے ٹسٹ کے ذریعہ فوج اور عوام کو قابلِ اعتماد ہتھیار مل سکتے ہیں۔ مگر ہم ابھی تک برطانیہ سے (ENFIELD) رائفل اور مشین گن وغیرہ منگوا رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے متعلق ماہرین کی جو کچھ رائے ہے وہ پیش کی جا چکی ہے۔

جرمنی، جاپان، امریکہ اور روس میں طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی کاریگر حکومت کو کوئی نیا ہتھیار پیش کرتا ہے تو وہ ایک خاص تعداد میں فوج کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور وہ میدان جنگ کے حالات و ضروریات کے مطابق اس کی مضبوطی، پائداری اور تکمیل کا امتحان کرتی ہے۔ اس کے بعد یہ استعمال شدہ ہتھیار فوجی ماہرین کی رپورٹ کے ساتھ فوجی آرڈیننس کے افسروں کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں ماہرین ساخت فیکٹری کے اندر مختلف قسم کے امتحان کرتے ہیں اور اس طرح ان کے متعلق صحیح رائے قائم کی جاتی ہے۔ مگر انگریزی طریقہ اس سے مختلف ہے۔ وہاں ہتھیار پر پروف کی مہر لگائی جاتی ہے۔ پھر امتحان کی۔ مگر مذکورہ بالا ممالک میں پروف کی مہر اس وقت لگائی جاتی ہے۔ جب ہتھیار آزمایش کے تمام مراحل کو کامیابی سے طے کر لیتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ برطانیہ صنعت اسلحہ سازی میں ان ملکوں سے اسی وجہ سے پیچھے ہو۔

برطانیہ اور دوسرے ممالک کی صنعت اسلحہ سازی میں ایک دوسرا فرق یہ ہے کہ برطانیہ میں اسلحہ سازی کی صنعت چند کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے اور جرمنی، جاپان اور روس وغیرہ میں چھوٹے چھوٹے کارخانے حکومت کی سرپرستی و نگرانی میں ہتھیار بناتے ہیں۔ حکومتیں ان کی مالی امداد کرتی ہیں۔ ان کو مفید مشورے دیتی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے نمونے مہیا کرتی ہیں اور تیار شدہ ہتھیاروں کو خرید کر ان کا امتحان کرتی ہیں۔ پھر جب وہ عملی تجربہ و آزمایش میں ٹھیک اترتے ہیں۔ تو سرکاری استعمال کے لئے ان کو آرڈر دے کر تیار کراتی ہیں +

پیدل فوج

پیدل فوج کب وجود میں آئی۔ اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ یوں سمجھئے کہ انسان نے شکم پُری کے لئے جب سے طاقت کا استعمال شروع کیا۔ اسی وقت سے اس کا آغاز ہوا۔ پہلے ایک انسان دوسرے انسان کے خلاف اپنی جسمانی طاقت استعمال کرتا تھا۔ اس کے بعد لاٹھی، تلوار، کلہاڑی اور چھوی سے کام لیا جانے لگا۔ پھر تیر و تفنگ ایجاد ہوئے اور گوپیا سے دشمن پر پتھر پھینکے جانے لگے۔ شاہنامہ فردوسی سے رستم و اسفندیار کی گرزوں کی لڑائی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح زمانۂ دراز تک دنیا کی پیدل فوجوں کے ہتھیار یہی رہے۔ فوج کے سردار میدان جنگ میں گدھوں، بیلوں، گھوڑوں، اونٹوں اور ہاتھیوں پر سوار ہو کر جاتے تھے۔ تاکہ لڑائی میں جو دست بدست ہوتی تھی شریک ہوں تو تازہ دم ہوں۔ سفر کی ماندگی سے نڈھال نہ ہو جائیں۔ رفتہ رفتہ گھوڑوں، بیلوں، اونٹوں اور ہاتھیوں پر سوار ہونے والے سواری کی حالت میں لڑنے لگے شروع میں چونکہ ایسے سواروں کی تعداد کم ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ پیدل فوج ہی میں شمار ہوتے تھے۔ مگر جب سوار ہونے کی وجہ سے میدان جنگ میں انہیں فوقیت حاصل ہوئی تو سواروں کا علیحدہ دستہ بنایا گیا اور ان کی حیثیت پیدل فوج کے معاون و مددگار کی ہوگئی اور اس کا نام رسالہ ہوگیا۔ اس کا ذکر ہم اگلے باب میں کریں گے۔

فوج کا یہ نوزائیدہ رسالہ ترقی کر کے بہت جلد جوان ہوگیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے بڑی شہرت حاصل کر لی۔ جب میدان جنگ کی ملکہ یعنی پیدل فوج پس پشت پڑنے لگی تو اس کے طرفداروں نے اس کی عظمت و اہمیت کو بحال کرنے کے

قدیم جنگ کا ایک منظر ۔۔ (تلواروں ۔ نیزوں ۔ تیروں اور کلہاڑیوں وغیرہ کا استعمال)

لئے مختلف تجویزیں سوچیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ جب پیدل فوج دشمن پر حملہ کرنے کے لئے جائے تو پلٹن کی تعداد بہت زیادہ ہو اور وہ اس طرح اتحاد و یکجہتی سے لڑے کہ جب رسالے کے سوار پلٹن پر حملہ کرنے کی کوشش کریں۔ تو وہ اسے بھالوں، برچھیوں اور تلواروں کی ناقابلِ تسخیر آہنی دیوار پائیں اور وہ دیوار ایسی ہو کہ دشمن کے سوار اس میں شگاف پیدا کر کے گذر نہ سکیں۔

مگر اس آہنی دیوار کو توڑنے کے لئے مختلف ترکیبوں سے کام لیا جانے لگا کہیں رتھ اور ہاتھی استعمال ہونے لگے اور کہیں سوار اور زرہ بکتر پہن کر پیدل فوج پر حملہ آور ہونے لگے ایسے شاہسواروں میں یورپ کے نائٹ (Knight) کا خطاب دیا گیا۔ نائٹ سر سے پیر تک غرق آہن ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ گھوڑوں کو بھی زرہ پہنا کر تیروں اور بھالوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

ہندوستان والوں نے آہنی رتھ تیار کئے۔ ہاتھیوں کو فولاد پہنا کر بہت خوفناک اور طاقتور بنایا تاکہ ان سے آہنی دیوار کو توڑنے کا کام لیا جا سکے

پیدل فوج کے حامیوں نے سائنس کی مدد سے بارود ایجاد کی اور اس طرح وہ پھر میدان جنگ کی ملکہ بن گئی۔ اس کے بعد پیدل فوج کے حریفوں نے بھی بارود کو توپوں کے ذریعے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ نپولین خود سائنس کا طالب علم رہ چکا تھا اور اس کے ہموطن سائنسدان اس کے شیدائی تھے۔ ان کی اور انجنیروں کی مدد سے اس کا توپ خانہ بہت متحرک بن گیا۔ وہ عین لڑائی کے دوران میں اپنے توپ خانہ کو گھوڑوں کی مدد سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے دشمن کی پیدل فوج کی صفوں کو توڑ کر رکھ دیتا تھا۔ اس قوت کی بنا پر اس نے وہ الفاظ کہے تھے جو بطور مثال آج تک پیش کئے جاتے ہیں۔ اس نے کہا کہ "**میدان جنگ میں شعور مند اور ثابت قدم آدمی کی ضرورت ہے**"۔ بہت سے آدمیوں کو جمع کر کے فوج کا ٹڈی دل بنا لینے سے کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس نے یہ اس لئے کہا کہ یورپ کی تمام حکومتیں پیدل فوج کی بہت بڑی تعداد اس کے مقابلہ پر لا رہی تھیں۔ مگر وہ بسا اوقات انہیں شکست دے کر منتشر کر دیتا تھا۔ جب نپولین شکست کھا کر قید ہوا تو لوگ اس کے دفاعی مقولے اسی طرح فراموش کر بیٹھے جس طرح اس سے پہلے ایشیا بلکہ دنیا کے بہترین دفاعی ماہر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دفاعی حدیث کو بھول چکے تھے۔

پیدل فوج کو اگرچہ دوڑ مار رائفل مل گئی تھی۔ مگر بڑی بڑی پیدل فوجوں کو جمع کر کے میدان جنگ میں لانا سارے دفاعی مبصروں میں مقبول رہا اور فوج کی طاقت کا اندازہ عددی فوقیت سے کیا جاتا رہا۔

مغربی دنیا میں رائفل کی ایجاد اس وقت ہوئی۔ جبکہ امریکہ میں جنگ آزادی جاری تھی۔ آیئے اب یہ دیکھیں کہ اس زمانے کے ہندوستان میں کیا ہو رہا تھا۔ یہ مسئلہ اس وجہ سے خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ پاکستان کی پلٹن۔ انڈین آرمی (ہندوستانی پیدل فوج) کے بطن سے ہوئی ہے۔

جس زمانے میں انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے تو وہ ایسٹ انڈیا کمپنی۔ سے تعلق رکھتے تھے سنہ ۱۶۰۰ء سے ۱۷۰۸ء تک ملک میں جہاں جہاں اس کمپنی کے ٹھکانے رہے۔ وہاں ان کی قلعہ نما تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ جن میں سامان تجارت محفوظ رکھا جاتا تھا۔ ان کوٹھیوں پر ملی جلی گورہ فوج متعین رہتی تھی۔ مگر ان کے ساتھ کمپنی نے کچھ ہندوستانی سپاہی بھی ملازم رکھ لئے تھے اور ان کے چھوٹے چھوٹے دستے مختلف صوبوں میں صوبائی ڈائرکٹروں کے ماتحت ہوتے تھے۔ ہندوستانی پلٹن کے سردار کو صوبیدار کہا جاتا تھا اور وہی امن و جنگ میں اس کا کماندار افسر ہوتا تھا۔

سنہ ۱۷۱۵ء سے ۱۸۵۷ء تک یہ پیدل فوجیں یعنی پریذیڈنسی بٹالین کمپنی کے بڑے ڈائرکٹر کے ماتحت آگئیں۔ برطانیہ کی شاہی فوج کا پہلا دستہ ہندوستان میں ۱۷۵۴ء میں آیا۔ اس کے بعد تین قسم کی پلٹنیں کمپنی کے ماتحت آگئیں۔ یعنی شاہی گورہ فوج۔ کمپنی کی یورپی فوج اور کمپنی کی ہندوستانی فوج ۱۸۵۷ء یعنی سو سال سے زیادہ عرصہ تک کمپنی کی فوج کی یہی تقسیم رہی۔

پلاسی کی لڑائی سے پہلے کلائیو نے ہندوستانی پلٹنوں میں حسب ذیل تبدیلیاں کیں:

(۱) ہر پلٹن میں تین برطانوی افسر اور کئی کئی سارجنٹ مقرر کئے۔

(۲) ہر پلٹن کی تعداد ۸۲۰ مقرر کی گئی اور انہیں دس کمپنیوں میں تقسیم کیا گیا۔

(۳) ہندوستانی کمان افسر کو صوبیدار میجر کا لقب دیا گیا اور اسے ایک ہندوستانی ایڈجوٹنٹ کے ساتھ پلٹن کے ہیڈ کوارٹر میں متعین کیا گیا۔

(۴) ان پلٹنوں کی وردی گورہ فوج کی طرح بنائی گئی۔ جس کی بنا پر اسے لال پلٹن کہا جانے لگا۔

(۵) اس وقت تک پلٹن اور کمپنیوں کی کمان یا سالاری ہندوستانی افیسر کرتے تھے مگر اب ان کی جگہ انگریز مقرر کئے گئے اور ہندوستانی کمان افسر برائے نام کمان افسر رہ گئے۔ بلکہ ہندوستانی افسر بھی ان انگریز افسروں کے ماتحت آ گئے۔

(۶) فوج کے گورہ عہدیدار (نان کمشنڈ افسر) یعنی سارجنٹ بھی ان ہندوستانی افسروں کے ماتحت نہ تھے۔ بلکہ انہیں برابری کا درجہ حاصل تھا۔

اس کے بعد ۱۷۹۶ء میں ہندوستانی افسروں کے رہے سہے اختیارات بھی ختم کر دیئے گئے۔ اور اب وہ محض نمود کے لئے رہ گئے جن کی حیثیت ہر لحاظ سے ماتحت کی تھی کیونکہ ہر پلٹن میں ۲۲ انگریز افسر مقرر ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں ہندوستانی فوجیں کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر شاہ انگلستان کے زیر اختیار آ گئیں۔

۱۸۸۶ء میں پیدل فوج کی رجمنٹ بنائی گئی اور پیدل رجمنٹ میں دو یا تین پلٹنیں رکھی گئیں۔ ہر پلٹن میں مختلف قوموں کے ملے جلے لوگ تھے۔ مگر گورکھوں کی پلٹنیں الگ تھیں۔ جن میں صرف گورکھے ہی ہوتے تھے۔

۱۸۹۵ء میں ہندوستانی ریاستوں کی فوجوں کو بھی براہ راست شاہی فوج کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہر پلٹن کو چار کمپنیوں میں تقسیم کیا گیا اور ایک ہیڈ کوارٹر کمپنی بنائی گئی۔ ہر کمپنی میں چار پلاٹون بنائے گئے۔

۱۹۰۳ء میں لارڈ کچنر نے بھی بہت سی تبدیلیاں کیں۔ جن میں نمایاں یہ تھیں کہ ہندوستان کی فوج میں گورہ فوج کو بہترین جدید ہتھیار، ہندوستانی فوج کے لئے دوسرے درجہ کے۔ اور ریاستی فوجوں کو سب سے پرانے ہتھیار دیئے گئے۔ اسلحہ کی تقسیم میں اس امتیاز کی وجہ بیان کرنے کی غالباً کوئی ضرورت نہیں۔

۱۹۱۷ء میں جب پہلی عالمی جنگ کے حالات برطانیہ کے موافق نہ تھے۔ حکومت ہند نے جہاں عربی و مصری دنیا کو آزادی بخشنے کے مواعید کر کے زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی وہاں ہندوستان میں بھی خود مختار حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا گیا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ فوج کو ہندوستانی بنایا جائے گا۔ یعنی اس کے افسر ہندوستانی ہی مقرر کئے جائیں گے۔ مگر چونکہ ہندوستانی فوج کے قابل لیڈر نہیں بن سکتے۔ اس لئے اس اسکیم پر رفتہ رفتہ عمل کیا جائے گا اور بطور قسط اول پانچ ہندوستانی نوجوانوں کو ہر سال تربیت کے لئے انگلستان بھیجا

جائے گا" اس پالیسی کی وجہ سے جب ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو ہندوستانی فوجی افسروں کی تعداد بہت کم تھی۔ لہذا پیدل فوج نے ۱۹۱۴-۱۸ء اور ۱۹۳۹-۴۵ء کی لڑائیاں زیادہ تر انگریز افسروں کے ماتحت ہی لڑی ہیں۔

۱۹۳۹ء میں ہندوستانی پیدل فوج کے اسلحہ رائفل، لیوس گن یعنی ہلکی قسم کی مشین گن، میکسم مشین گن، ٹرینچ مارٹر اور ہاتھ سے پھینکنے والے بم تھے یہ اسلحہ یعنی کارتوس بم، لیوس گن یا میکسم مشین گن وغیرہ یا تو خچروں پر لاد کر لے جائے جاتے تھے یا ہلکی موٹر لاریوں پر۔ جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی تو پیدل فوج کو برین گن دی گئی۔ یہ ہلکی مشین گن تھی جسے اگر تپائی پر چلایا جائے تو بڑی قسم کی مشین گن کا کام بھی دے سکتی ہے۔ اس مشین گن کے لئے ایسی موٹر گاڑی تیار کی گئی جو ناہموار اور دشوار گذار علاقوں میں بھی چل سکتی تھی۔ اس کا نام برین کیریئر (Bren carrier) رکھا گیا اور اس پر ٹرینچ مارٹر بھی لگا دی گئی۔

اس طرح ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۹ء ہندوستان کی پیادہ پلٹن میں بہت کم انقلاب ہوا۔ اس کی تعداد وہی رہی۔ جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاتی تھی تو پیادہ ہی چلتی تھی۔ اس کی تقسیم کمپنیوں اور بٹالین ہیڈ کوارٹر میں رہی۔ البتہ مذکورہ ہتھیاروں کے علاوہ ربط باہمی کے لئے چند سگنل اور چند ایسے آدمی دیئے گئے جو بٹالین کے سپاہیوں کو صحیح طریقہ سے مورچہ بندی کرنے، خندقیں کھودنے اور سرنگیں وغیرہ لگانے کے کاموں میں مدد دے سکتے تھے۔

۱۹۱۴-۱۸ء کی لڑائی کے بعد برطانیہ میں متعدد تجربے کئے۔ اور بالآخر کئی سال کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ پیدل پلٹن دو قسم کی ہونی چاہیئے۔ ایک قسم رائفل کمپنیوں کی ہوگی۔ جس سے مراد یہ ہے کہ ان میں صرف لڑنے والے جوان ہوں گے۔ دوسری میں صرف مشین گنیں ہوں گی۔ چنانچہ پہلی کا نام رائفل بٹالین رکھا گیا اور دوسری کا مشین گن بٹالین۔ ان ترتیب کی وجہ یہ تھی کہ برین (Bren) یعنی نئی ہلکی قسم کی مشین گن ایجاد ہو چکی تھی اور اس کے لئے ایسی گاڑیاں تیار کی جا چکی تھیں۔ جو دشوار گذار زمین پر آسانی سے آجا سکتی تھیں اور مشکل حالات میں فائرنگ کے ذریعے لڑنے والے جوانوں کو مدد دے سکتی تھیں۔ برین گن کی ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ ایک
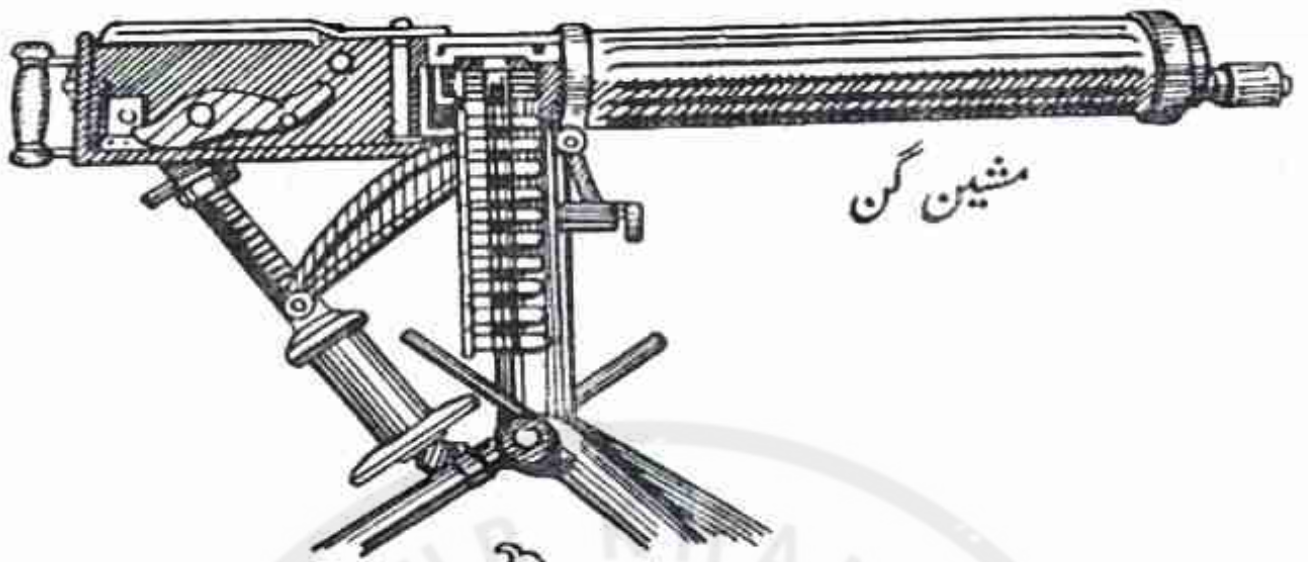
مشین گن
توڑے دار رائفل
رائفل
توپ
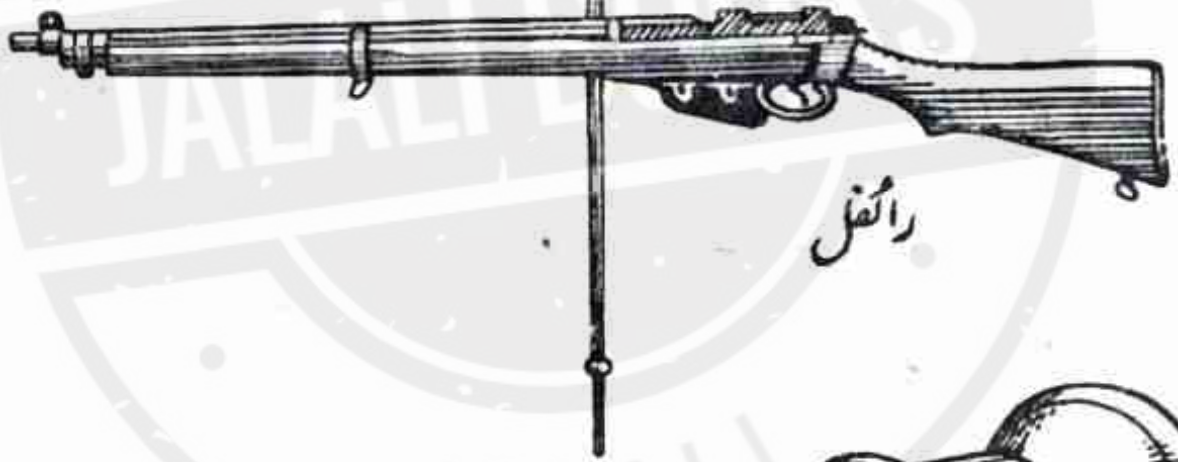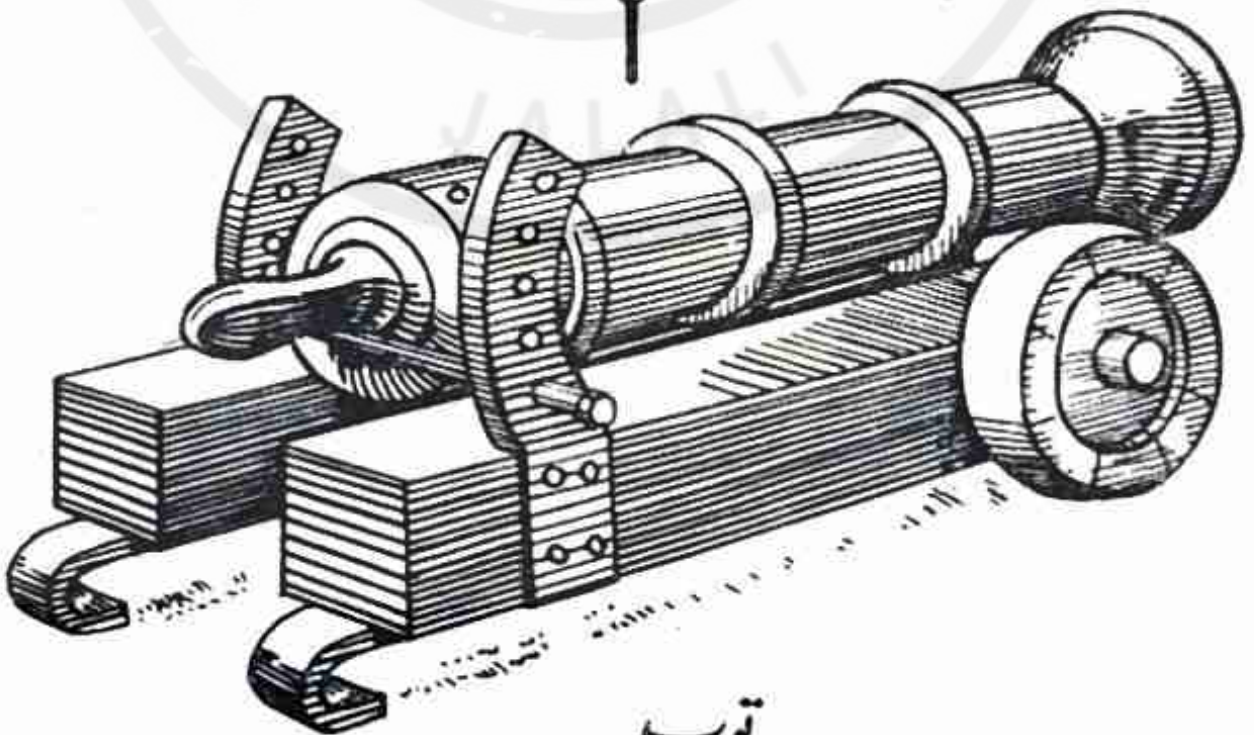
آدمی اسے بسہولت اور بغیر کسی تکان کے ایک جگہ سے دوسری جگہ اُٹھا کر لے جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مشین گن کو لے جانے کے لئے کم از کم دو آدمیوں کی ضرورت ہے پھر بھی بوجھ کی وجہ سے وہ اسے زیادہ فاصلہ پر نہیں لے جا سکتے۔

ٹینک کے میدان جنگ میں آجانے کی وجہ سے جو رسالے کے قائم مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ پلٹن کو ۶ پونڈ والے گولے کی ٹینک شکن توپ دی گئی۔ اس کے ساتھ لڑنے والی رائفل بٹالین کو ایک ایسی پلاٹون دی گئی۔ جس کے پاس دو انچ کے ٹرینچ مارٹر تھے۔ تاکہ مورچہ کے عقب میں چھپے ہوئے دشمن پر حملہ کیا جا سکے۔ حالات چونکہ بہت کچھ تبدیل ہو چکے تھے۔ اس لئے پائنیرڈل (نیم تربیت یافتہ انجینئروں) کی ایک پلاٹون بھی شامل کی گئی۔ اس طرح برطانوی پلٹن کے اجزائے ترکیبی یہ ہو گئے۔

لڑنے والے جوانوں کی چار رائفل کمپنیاں جن کی مدد کے لئے

(۱) برین گن کیریئر

(۲) ۲ انچ ٹرینچ مارٹر کی پلاٹون۔

(۳) پائنیئر پلاٹون۔

(۴) ۶ انچ والی ٹینک شکن توپ۔

(۵) ہر رائفل پلاٹون کے ساتھ موٹر لاریاں تاکہ جوان اپنا فالتو سامان مثلاً گرم کوٹ (برانڈی) وغیرہ اس پر لاد سکیں۔ دوسرے لفظوں میں لڑنے والے سپاہی کو تازہ دم رکھنے کے لئے اس پر سامان کا بار بھی کم سے کم کر دیا گیا۔ ان تبدیلیوں سے لڑنے والے جوان دشوار گذار زمین پر بھی اپنی بٹالین کے ہتھیاروں کے کارگر فائرنگ کی وجہ سے پیش قدمی کرنے کے قابل ہو گئے۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم کر دی گئی۔ مگر چونکہ ان کے پاس بہت سے ایسے ہتھیار تھے۔ جن سے وہ کثیر تعداد میں فائر کر سکتے تھے۔ لہذا وہ بڑی حد تک آزاد ہو گئے۔ برین گن کی مدد سے وہ ایسے دشمن پر بھی جو نظروں سے اوجھل ہو۔ دن اور رات کے ہر حصہ میں فائر کر سکتے تھے۔ نیز دشمن کے ہوائی جہازوں کے خلاف بھی کارروائی کر سکتے تھے۔

اس ترقی سے رائفل کی حیثیت ثانوی ہو گئی۔ یعنی اب وہ مددگار ہتھیار بن کر رہ گئی۔ یہ گویا اس کا تنزل تھا۔

پھر مذکورہ بالا ہتھیاروں کے علاوہ اب رائفل بٹالین کو اسٹین گن ہینڈ گرینڈ

اور ٹینک شکن رائفل پیٹ (Piat) دی گئی اور اب پیٹ کی جگہ بزوکا (Bazooka) قسم کی رائفل نے لے لی ہے۔ ۲ انچ کے ٹرینچ مارٹر میں دھواں پیدا کرنے والے گولے بھی چلائے جا سکتے ہیں جنھیں مختلف اشاروں یا نشان دہی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کو ویری لائٹ (Vary Light) پستول کہتے ہیں۔

یہاں پائنیر سپاہیوں کا مختصر حال بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ چونکہ آج کل کی جنگ مشینی ہو گئی ہے۔ اس لئے پیدل فوج کے لئے اب ایسے مددگاروں کی ضرورت ہے جو ان کو

۱۔ چھپنے (Camouflage) میں مدد دے سکیں۔

۲۔ مورچہ بندی میں مشورہ دیں۔

۳۔ مزاحمتیں پیدا کر سکیں یعنی دشمن کے ٹینکوں کے راستے مسدود کر سکیں۔ یا مخدوش بنا سکیں۔

۴۔ فوج کے پڑاؤ میں پانی وغیرہ نکالنے میں مدد دیں۔

۵۔ دشمن کی بچھائی ہوئی سرنگوں کو صاف کریں اور اس کے خلاف سرنگیں بچھانے کی تدبیریں اختیار کریں۔

یورپ کی لڑائی میں ہندوستانی فوج کی پیدل پلٹن کے مقابلہ میں برطانوی پیدل سپاہی بہتر اسلحہ سے مسلح ہو کر شریک ہوا۔ پھر بھی بہت سے دفاعی مبصروں کا خیال تھا کہ اب پلٹن کو لڑانے کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ رسالے کے گھوڑے کی طرح اب پیادہ سپاہی کی جگہ مشین گن کو ملنی چاہیئے۔ مگر ۴۵-۱۹۴۴ء کی یورپی لڑائیوں اور جاپان کے خلاف نبرد آزمائیوں نے یہ ثابت کر دیا کہ مشین اگرچہ انسان پر حاوی ہو گئی ہے۔ مگر وہ انسان کی جگہ نہیں لے سکتی۔ البتہ ضرورت اس کی ہے کہ اسے بہتر اسلحہ سے مسلح کیا جائے۔ اسی بنا پر یورپ و امریکہ کی پیدل فوجوں میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں بھاری رائفل کو قطعی طور پر ترک کر دیا گیا۔ کیونکہ پیادہ پلٹن کو اس کا کام کرنے کے لئے جدید قسم کے ہتھیار بزوکا یعنی ٹینک شکن، سب مشین گن، مشین گن، ٹرینچ مارٹر، فلیم تھرو وار (Flame Thrower) شعلہ انداز یا آگ برسانے والے آلات دے دیئے گئے اور پیدل فوج کی مدد کے لئے ٹینکوں، دشوار گذار علاقوں میں چلنے والی توپوں، اور ہوائی جہازوں کا استعمال ضروری سمجھا گیا۔ مغرب کے ان دفاعی مبصرین نے اس بات

کو تسلیم کیا کہ انسان جنگ میں اسی وقت بہترین طریقہ پر لڑ سکتا ہے۔ جب وہ تازہ دم ہو۔ لہذا حملہ کرنے سے پہلے پیدل فوج کو موٹروں یا ٹینکوں میں سوار کرا کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ نیز پیادہ سپاہی کے لئے تلوار و سنگین کے مقابلہ میں آگ یا لوہا برسانے والے ہتھیار زیادہ مفید اور فیصلہ کن قرار دیئے گئے اسی لئے پیدل سپاہیوں کی اس تعداد کو جس کے ہاتھ میں رائفل دی گئی تھی کم کر دیا گیا۔ پھر چونکہ وہ رائفل جو آج کل ہندوستان یا پاکستان میں نظر آ رہی ہے۔ بہت بھاری ہے اور اس کا کارتوس بڑا ہونے کی وجہ سے وزنی ہوتا ہے۔ لہذا اس کی جگہ ہلکی قسم کی رائفل دی گئی جس کی گولی کی مار تین سو گز تک ہے، جس سے بہت تیزی کے ساتھ گولی چلائی جا سکتی ہے اور جس کی سنگین بھی ہلکی اور چھوٹی ہے۔

اس کے علاوہ پیدل فوج کو **بزوکا** قسم کی ٹینک شکن بندوق دے کر اسے بڑی حد تک ٹینک کے حملہ سے محفوظ بنا دیا گیا۔ بزوکا قسم کی نئی بندوق سپاہی اپنے کندھے پر لگا کر آسانی سے چل سکتا ہے اور اس کی گولی کئی انچ موٹی فولادی چادر کو توڑ کر پار ہو جاتی ہے۔ اس کی مار تین سو گز تک بہت اچھی ہے۔

اس طرح مغرب نے پلٹن یعنی پیدل فوج کو پھر میدان جنگ کی ملکہ بنا دیا اور اس لئے بنا دیا کیونکہ اس کے دفاعی مبصرین کی رائے میں مشین کو چلانے والا انسان ہی ہے اور مشین کے ذریعہ تباہی و غارتگری کرنے کے بعد کسی جگہ پر قبضہ کرنا انسان ہی کا کام ہے۔ مگر چونکہ خود وہ گولی کے مقابلہ میں کمزور ہے لہذا جن انسانوں کے ہاتھوں میں آگ اور لوہا برسانے والے آلات ہوں گے۔ وہ یقینی طور پر دشمن پر فتحمند ہوں گے ۱۹۳۹-۴۵ء کی عالمی جنگ میں یہ چیز اتحادی اور جاپانی سپاہیوں کی لڑائی میں واضح طور پر ثابت ہو چکی ہے۔ جنرل میک آرتھر کے پاس بہترین قسم کے جدید ہتھیار تھے۔ اس لئے ان کے مقابلہ میں جاپانیوں کا جذبہ جان فروشی اور ایثار و قربانی بیکار ثابت ہوا۔ جاپانیوں کے مورچے بہت اچھے اور مضبوط تھے۔ مگر امریکی سپاہیوں نے فلیل کی مدد سے آگ برسا کر انہیں انہی کے مورچوں میں جلا کر خاک کر دیا۔

مختصر یہ کہ مشین کو چلانے کے لئے انسان کی ضرورت ہے اور ایسے انسان میں جہاں صحت، قوت، ہمت اور عزم و حوصلہ کا موجود ہونا ضروری ہے وہاں ان اسلحہ کے استعمال سکھلانے والوں کی بھی ضرورت ہے۔ یہ دونوں میسر آ جائیں تو ان ہتھیاروں کی مرمت کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ورکشاپوں اور کارخانوں کا قیام ضروری ہے۔ لیکن جب تک ملک خود ان ہتھیاروں کو نہ بنائے گا محض مرمت سے یہ مفید و جدید نہیں رہ سکتے۔

رسالہ اور ٹینک

گھوڑے کی اہمیت

ایشیائی اقوام کی قسمت بدلنے میں جتنا حصّہ گھوڑے کا ہے۔ اتنا کسی دوسرے جانور کا نہیں۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور تاتاریوں نے گھوڑے کو ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھا تاتاریوں نے اسی کی پشت پر بیٹھ کر۔ یورپ افریقہ کے بہت سے حصّوں کو فتح کیا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جب دیوتاؤں نے دودھ کے سمندر کو بلویا تو اس میں سے گھوڑوں کا بادشاہ پیدا ہوا جس کا رنگ سفید تھا۔ اندر نے دودھ کی طرح اس سفید گھوڑے کو اپنی سواری کے لئے پسند کیا۔ رگ وید میں جو غالباً چودہ سو سال قبل مسیح تصنیف ہوا تھا اشومیدھ یگمیہ کا ذکر ہے۔ یہ گھوڑے کی قربانی کی رسم تھی۔ جسے سب سے بڑی اور سب سے اعلےٰ درجہ کی قربانی سمجھا جاتا تھا۔ یہ رسم مدت تک جاری رہی اور سارے راجے مہاراجے اس کو ادا کرتے رہے۔

قدیم زمانہ میں ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ گھوڑے کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اور جہاں جہاں وہ جاتا تھا وہ علاقہ گھوڑا چھوڑنے والے راجہ کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی راجہ گھوڑے کو پکڑ لیتا یا قتل کر دیتا تو اس سے لڑائی ہوتی۔ اگر سال بھر کے بعد گھوڑا گھوم پھر کر واپس آجاتا تو اس کا مالک راجہ بہت بڑا جشن کرتا اور اس میں اس گھوڑے کی قربانی کی جاتی۔

ہندوؤں کے پرانے عقیدہ کے مطابق گھوڑوں کی چار ذاتیں ہیں۔

اوّل براہمن جس کے پسینہ میں صندل کی خوشبو ہوتی ہے۔ یہ گھوڑا میدان جنگ میں بہت دلیر ہوتا ہے۔

دوم۔ کشتریہ۔ اس کے پسینہ میں دودھ کی سی خوشبو ہوتی ہے۔ یہ گھوڑا اپنے مالک کا بہت وفادار ہوتا ہے اور اسے آخری منزل تک اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ کبھی ہمت نہیں ہارتا۔

سوم۔ ویشیہ اس گھوڑے کے پسینہ کی خوشبو گھی کی طرح ہوتی ہے۔ یہ بھاگتا تو خوب ہے۔ مگر ڈرتا اور بدکتا ہے۔

چہارم۔ شودر اس گھوڑے کا پسینہ مچھلی کی طرح بدبودار ہوتا ہے۔ میدان جنگ میں بزدل ہوتا ہے اور مالک کو گرا کر بھاگ جاتا ہے۔

اب اسلامی دنیا کی طرف آیئے۔ یہاں ہر جگہ بلا استثنا گھوڑے کی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری کے لئے شب اسریٰ جو براق بھیجا گیا وہ بھی گھوڑے جیسا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ قرآن مجید میں کئی جگہ گھوڑوں کا ذکر ہے۔ اور گھوڑے رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ آنحضرت گھوڑے کو بہت پسند فرماتے تھے۔ آپ نے اسے بڑا درجہ عطا کیا اور سوار کو مال غنیمت میں سے دو حصے عطا فرما کر گھوڑے کا حصہ مجاہد کے حصہ کے برابر قرار دیا۔ پھر اپنی گوناگون خوبیوں کی وجہ سے عربی گھوڑا ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ چنانچہ آج دنیا کی بہترین نسلیں خواہ وہ ایشیا دیورپ میں ہوں۔ یا امریکہ میں ان میں سب سے افضل وہ گھوڑے سمجھے جاتے ہیں۔ جو عربی گھوڑوں کی نسل سے ہیں۔ مثلاً برطانوی گھوڑوں کی چار نسلیں مشہور ہیں۔ اور وہ چاروں عربی النسل ہیں۔

گھوڑے کے متعلق اتنی تفصیل پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں اس نے جو پارٹ ادا کیا ہے اس کی اہمیت کسی حد تک واضح ہو جائے جہاں تک تاریخ اسلام اور مسلمانوں کے عروج کا تعلق ہے اس میں گھوڑے کا حصہ ہمیشہ بہت بڑا رہا ہے اس کی ابتداء آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے ہوئی ہے۔ غزوہ بدر کے بعد اس کی اہمیت روز بروز بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ آنحضرت نے جیسا کہ ابھی بتایا گیا مال غنیمت میں سے پیادہ کے مقابلہ میں سوار کے دو حصے مقرر فرما کر اور گھوڑے کا حصہ مجاہد کے حصہ کے برابر قرار دے کر گھوڑا رکھنے کی ہمت افزائی فرمائی۔ یہ گھوڑا ہی تھا۔ جس کی مدد سے مسلمانوں نے دنیا میں کفر و شرک اور ظلم و طغیان کی پناہ گاہوں کو تہ و بالا کر کے توحید اور عدل و مساوات کا سکہ جاری کیا۔ خالد، ابو عبیدہ، طارق،

محمد بن قاسم، محمود غزنوی، بابر اور آخر میں ترک اسی وجہ سے ہر جگہ فتحمند ہوئے کہ انہوں نے میدان جنگ میں گھوڑے کا صحیح طور سے استعمال کیا۔ غازی صلاح الدین ایوبی نے اسی کی مدد سے صلیبی حملہ آوروں کے چھکے چھڑائے اور یہ گھوڑے کی بے قدری ہی تھی کہ مغلوں کو ہندوستان میں مرہٹوں کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہونا پڑا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دوسرے عوامل کار فرما نہ تھے اور محض گھوڑے کی بے قدری ہی اس تباہی کی وجہ موجب تھی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جہاں اور غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئیں۔ وہاں ایک بڑی کوتاہی میدان جنگ میں گھوڑے کے استعمال سے بے پروائی بھی تھی۔ اس کی دوسری مثال ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی جنگ میں اتحادیوں کے مقابلہ میں ترکوں کی شکست تھی۔ ترک فوج میں غالب تعداد پیدل فوج کی تھی وہ انتہائی بہادری سے لڑی۔ مگر یہ ہمارا ذاتی مشاہدہ ہے کہ اتحادی رسالوں اور لارنس کے ساتھیوں یعنی غدار عربوں نے گھوڑے کو استعمال کرکے دنیائے اسلام پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ بیت المقدس جسے یورپ کی ساری متحدہ طاقت بھی فتح کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر صلیب پرستوں کے قبضہ واختیار میں چلا گیا۔

ہمسایہ ملک افغانستان کو دیکھئے جب تک افغان شہسوار رہے۔ دنیا ان سے خوفزدہ رہی۔ محمود غزنوی نے ایک طرف ہندوستان کو فتح کیا تو دوسری طرف سلطنت روما کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور یہ سب گھوڑے کی مدد سے۔

مگر آج گھوڑے کا کیا مقام ہے۔ کیا مشین نے گھوڑے کی جگہ نہیں لے لی؟ اس کا جواب اثبات میں بھی دیا جا سکتا ہے اور نفی میں بھی۔ اثبات میں اس لئے کہ یہ سائنس اور مشینوں کی ایجاد کا زمانہ ہے۔ ان ملکوں میں جہاں مشینوں کا دور دورہ زیادہ ہے اور انہیں ہر جگہ لے جایا جا سکتا ہے۔ زمین پر چلا کر اور ہوا میں اڑا کر دونوں طرح، وہاں یقیناً گھوڑے کی جگہ اس نے لے لی ہے۔ مگر اس کے باوجود قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ گھوڑے کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئے اور اب گھوڑے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ مشینی دور کی ترقیوں کے باوجود اس کی اہمیت اب بھی باقی ہے۔ صرف زراعت وفلاحت اور باربرداری ونقل وحرکت کے معاملہ ہی میں نہیں۔ بلکہ فوجی نقطۂ نظر سے بھی اور اس کا ثبوت اسپ سواروں کے وہ باقاعدہ دستے اور گھوڑے کی نسل کشی کے وہ طریقے اور ذرائع ہیں جو دنیا کے تقریباً تمام مہذب ملکوں میں

اختیار رکئے جا رہے ہیں۔

عموی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مشین نے گھوڑے کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ لیکن تاریخ انسانی میں اور بھی کئی ایسے دور آئے ہیں جب گھوڑے کی اہمیت کو فراموش کیا گیا۔ مثلاً کسی زمانہ میں بیل سے وہ کام لیا جاتا تھا جو بعد کو گھوڑے سے لیا گیا۔ مگر بالآخر گھوڑے کو اس کی جگہ حاصل ہو کر رہی کیونکہ اس کی پھرتی، سبک رفتاری، بے خوفی اور تیز گامی کا حریف کوئی دوسرا جانور نہیں بن سکتا۔

بہرحال اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ پاکستان کے لئے گھوڑے کی اہمیت کیا ہے؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد اسپ سوار رسالوں کی اہمیت پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈال لی جائے۔

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا اتنی ہی اسے زیادہ فوج رکھنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ ہندوستان کا سیاسی شیرازہ ۱۷۵۰ء میں بکھر چکا تھا۔ طوائف الملوکی عام تھی۔ چھوٹے چھوٹے حکمران خود مختار بن بیٹھے تھے۔ اور ان کی طاقت و خودمختاری کا انحصار زیادہ تر ان کی اس فوجی جمعیت پر ہوتا تھا جو وہ فراہم کر لیتے تھے۔ جن میں غالب حصہ رسالہ کا ہوتا تھا۔ وہ جب بھی موقع دیکھتے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے علاقوں سے نکل کر دھاوے بولتے اور لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے۔ یہ رسالے ملازم نہ تھے۔ بلکہ ان پرائیویٹ افراد پر مشتمل ہوتے تھے جو فوجی اسپرٹ رکھتے تھے اور بہ حیثیت طبقہ اپنی عسکریت کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے علاقہ یا ریاست کے فرمانروا کے حکم کی تعمیل کے لئے تیار رہتے اور جب لوٹ مار اور جنگ و جدال کی مہم سے فارغ ہوتے تو مال غنیمت میں سے اپنا حصہ لے کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ چونکہ یہ رسالے پرائیویٹ ہوتے تھے اس لئے ان کی نفری (تعداد) بھی مختلف ہوتی تھی۔ کچھ چھوٹے ہوتے۔ کچھ بڑے۔ رسالہ کا سردار جتنی جمعیت اکٹھا کر سکتا۔ ان کا دستہ اتنا ہی چھوٹا بڑا ہوتا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایسے بہت سے حکمرانوں سے معاہدے کئے۔ ضرورت کے وقت وہ ان سے رسالے حاصل کر کے اپنا کام نکالتی اور بطور حق الخدمت انہیں معاوضہ دے دیتی۔ مگر یہ انتظام اطمینان بخش ثابت نہ ہوا۔ اس لئے سنہ ۱۸۲۰ء میں کمپنی نے اپنے سوار بھرتی کئے جنہیں سلحدار کہا گیا۔ ہر سلحدار اپنا گھوڑا، اس کا ساز

اور تلوار خود لاتا اور کرنل یا کمان افسر کے سامنے بھرتی کے لئے پیش ہوتا۔ اگر کمان افسر اسے پسند کر لیتا تو وہ بھرتی ہو جاتا اور اپنے رسالے کا باقاعدہ ملازم قرار پاتا۔ اس کو تنخواہ اتنی دی جاتی۔ جس سے وہ گھوڑا، اس کا سازوسامان اور اپنی وردی ٹھیک رکھ سکے۔ اگر گھوڑا امن کے زمانہ میں مرجاتا تو سلحدار کو دوسرا گھوڑا اپنے پاس سے خریدنا پڑتا اور اگر سرکاری کام میں یا جنگ میں زخمی ہو کر مرجاتا تو کمپنی مہیا کرتی۔

عام طور پر سلحدار کی مدتِ ملازمت ۲۴ سال ہوتی تھی۔ سلحداروں ہی سے بعض لوگ ترقی پا کر سردار بنتے تھے۔ امراء و رؤسا کو ایک یا ایک سے زیادہ رسالہ بھرتی کرنے کی اجازت تھی۔ ایسی صورت میں ان کے لڑکوں یا رشتہ داروں کو براہ راست جمعدار یا رسالدار یا رسالدار میجر مقرر کیا جاتا۔

تقریباً چالیس اسپ سواروں کے دستے کو ترپ کہا جاتا تھا۔ اگرچہ پلٹن کی طرح کمان عام طور سے انگریز افسروں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ مگر ۱۸۸۶ء تک ہندستانی کمان افسر بھی مقرر ہوتے رہے۔ البتہ دو تین رسالوں میں ایک انگریز افسر اور اس کے ماتحت ایک یا دو نائب اور کچھ سارجنٹ بطور اسٹاف رہتے تھے جو میدان جنگ میں رسالے کے کمان افسروں کو احکام جاری کرتے اور زمانۂ امن میں ان کی تربیت اور نظم و ضبط کے ذمہ دار ہوتے۔

۱۸۸۶ء کے بعد رسالوں میں تغیر ہوا اور ہر رسالے میں ۶ انگریز افسر مقرر ہوئے اور رسالے اور اس کے اسکواڈرن کی کمان براہ راست انگریزوں کے ہاتھوں میں دے دی گئی۔ ترپ کے سالار جمعدار اور رسالدار تھے۔ لہٰذا پیادہ فوج کی طرح ان کے اختیارات کی باگ ڈور بھی ہندوستانیوں سے لے کر انگریزوں کے ہاتھ میں دے دی گئی۔

رسالوں کی ترکیب یہ تھی کہ ہر رسالہ میں تقریباً چھ سو گھوڑے اور چار اسکواڈرن ہوتے تھے اور ایک ہیڈ کوارٹر اسکواڈرن۔ اسکواڈرن میں چار ترپ اور ہر ترپ میں چالیس سوار اور چار سیکشن ہوتے۔

یہ ترکیب اور یہ تعداد ۱۹۱۴ء تک قائم رہی۔ جب مصنف بہ حیثیت سلحدار رسالہ میں بھرتی ہوا۔ تو اس وقت حالات کم و بیش یہی تھے۔

اب ہتھیاروں کا حال سُنئے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں رسالے کے ہتھیار یہ تھے۔

۱۔ سپاہی یعنی سلحدار۔ تلوار، بَلم، رائفل اور ایک سو بیس کارتوس۔

۲۔ عہدیدار۔ تلوار۔ رائفل اور ایک سو بیس کارتوس۔

۳۔ سردار۔ (جمعدار رسالدار) تلوار، پستول اور دُوربین۔

ہر ٹروپ کے پاس چار یا چکسن مشین گنیں ہوتیں اور ہیڈ کوارٹر اسکواڈرن میں چار میکسم مشین گنیں جنھیں گھوڑوں پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا۔

سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو رسالوں نے انہی حالات میں اس میں شرکت کی۔ پھر جیسے جیسے جنگ لمبی ہوتی گئی نئے آلات جنگ استعمال ہوتے گئے۔ مثلاً رسالوں کو خچروں کی بجائے۔ باربرداری کے لئے کچھ موٹر گاڑیاں مل گئیں۔ خبررسانی کے لئے موٹرسائیکلیں اور ہلکی قسم کی موٹر گاڑیاں حاصل ہوگئیں مشین گنوں کی تعداد فی رسالہ چار کے بجائے ۱۶ ہوگئی۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں جنگ کے تجربات کی بنا پر تمام رسالوں کی تعداد ۴۲ کی جگہ ۲۱ کر دی گئی اور بجائے سلحدار کے انھیں نان سلحدار (Non Silladar) کردیا گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ گھوڑا اور ساز و سامان مہیا کرنے کی ذمہ داری حکومت نے اپنے ذمہ لے لی۔ ان تبدیلیوں یا ترقیوں سے سب کی توجہ مشینوں کی طرف ہوگئی۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں بطور تجربہ مصنوعی جنگ کی گئی تو چونکہ پرانے رسالے کے نظام پر لڑنے والی فوج کو فتح ہوئی۔ اس لئے رسالے کے گھوڑوں کو مشینوں سے تبدیل کرنے کے رجحان میں کمی ہوگئی۔ مگر یورپ کے دفاعی مبصروں کے دماغوں پر مشین مسلط ہوچکی تھی۔ وہاں اس کا استعمال برابر بڑھتا اور ترقی کرتا رہا۔

مملکت برطانیہ کو سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی لڑائی میں مالی اعتبار سے بہت زیادہ زیر بار ہونا پڑا تھا۔ لہٰذا اس نے فوج میں غیر معمولی قسم کی تبدیلیاں نہ کیں حالانکہ جدید قسم کی مشینیں گھوڑے کی اہمیت کو کم کرچکی تھیں۔

اہل برطانیہ گھوڑے کے بہت شوقین ہیں۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں انھوں نے مشینی باربرداری کے خلاف ایسا قانون پاس کیا کہ ریل کے انجن کی ترقی عرصہ تک رکی رہی۔ پھر جب بوئر وار (Boer) شروع ہوئی تو جنگی ضروریات کی بنا پر ریل گاڑی اور اس کے انجن کو ترقی کرنے کا موقع ملا۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں رسالے کے گھوڑے کے متعلق دفاعی مبصرین کی کیا رائے تھی اور اسے کس طرح استعمال کیا گیا تھا لیکن اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے خیالات پر ایک نظر ڈال لیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ پیدل فوج پر تفوق حاصل کرنے کے لئے رسالہ کی تشکیل ہوئی رسالے کے سوار کو دو فائدے ہوئے ایک یہ کہ وہ پیدل سپاہی کے مقابلے میں بلا تکان گھوڑے کی پشت پر طویل مسافتیں طے کر سکتا تھا دوسرے یہ کہ گھوڑے کی تیز رفتاری بے باکی اور ہیبت سے وہ پیدل پر عموماً جلد حاوی آ جاتا تھا۔ لہذا جب پیدل فوج کے ہاتھ میں رائفل آئی تو رسالے کو رائفل کے علاوہ تلوار اور نیزہ بھی ہاتھ میں رکھنا پڑا۔ اس کے بعد پیدل فوج نے مشین سے مدد طلب کی اور سب سے پہلے سنہ ۱۴۷۲ء میں ولٹوریو (Valturio) نے ایسی رتھ ایجاد کی جو اپنی توپوں سمیت دشمنوں کی صفوں میں جا کر حملہ کر سکتی تھی۔ یہ گویا ایران کے دفاعی مبصرین کی ایجاد کا جواب تھی۔ جن کی نقل اہل یورپ نے کی تھی جنہیں نائٹ کا خطاب دیا گیا تھا۔ پھر عرصہ تک اس قسم کے تجربے ہوتے رہے کہ میدان جنگ میں جہاں دشمن پر زیادہ سے زیادہ کاری ضرب لگے وہاں اپنا نقصان کم سے کم ہو۔ جنگ میں حملہ آور دشمن پر دو طریقے سے وار کر سکتا ہے یا تو قریب سے حملہ کر کے جسمانی طاقت کی بنا پر اسے مغلوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یا دور سے ہتھیاروں کی مدد سے حملہ کرتا ہے۔ چونکہ قریب کی دست بدست لڑائی میں اپنے نقصان کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ لہذا وہ عموماً دُور ہی سے حملہ کرنا پسند کرتا ہے۔ تاکہ ذاتی طور پر اسے حتی الامکان کم سے کم نقصان پہنچے۔ یہ انسان کی فطرت ہے اور ساری نئی ایجادیں اسی انسانی فطرت کی بنا پر معرض وجود میں آتی ہیں۔

سنہ ۱۸۹۵ء میں پیدل فوج نے رسالے کو شکست دینے کے لئے بائیسکل سوار بٹالین بنائی اور ہر بائیسکل کے ساتھ ایک ٹریلر (Trailer) لگایا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں یورپ میں فوج کے لئے موٹر لاری استعمال ہونا شروع ہو گئی تھی اور سب سے پہلے جرمنی نے اپنی پلٹن کو موٹر لاریوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا۔ لیکن سوئٹزرلینڈ کی فوج سنہ ۱۹۱۰ء میں ایسی لڑنے والی موٹر گاڑی ایجاد کر چکی تھی جو زمین پر اور پانی میں یکساں چل سکتی تھی اور جس پر سے مشین گن بھی چلائی جا سکتی تھی۔ اٹلی والے سنہ ۱۹۱۲ء میں ترکوں کے خلاف زرہ پوش موٹر گاڑی استعمال کر چکے تھے۔ مگر دوسرے ملکوں نے

ان تجربات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ دنیا کے فوجی افسر گھوڑوں کے بالخصوص اس لئے دلدادہ تھے کہ جہاں یہ میدان جنگ میں بہت مددگار ہوتے تھے۔ وہاں امن کے زمانہ میں سیر و شکار، پولو اور دوڑ میں کام آتے تھے۔ اس لئے مشین کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔

مگر جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی اور فوجیں مورچوں میں پناہ گزین ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جم گئیں تو رسالے بیکار ہو گئے۔ تاہم ایشیاء کے میدان جنگ میں مثلاً عراق، عرب اور فلسطین میں رسالوں نے فتوحات حاصل کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ اس لئے جہاں یورپ نے ۱۹۱۸ء کے بعد مشین کی طرف توجہ کی۔ وہاں ایشیا کے اندر رسالے کی اہمیت میں کوئی بڑا فرق پیدا نہیں ہوا۔ اور ہندوستان میں تو ۱۹۳۶ء تک رسالوں کے اندر کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ اگر رسالے کی باربرداری کو موٹر لاری سے بدل دیا گیا تو اس سے اسپ سوار کی جنگ کے اصول میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔

لیکن یورپ کی رائے اس وقت بدل چکی تھی۔ اس کے نزدیک اب گھوڑا ہی لڑنے والی فوج کی نقل و حرکت اور برق رفتار حملہ کا ذریعہ نہ تھا۔ بلکہ اس کی جگہ مشین لے سکتی تھی۔ یورپ کی مختلف قوموں نے رسالے کی بجائے لڑنے والی فوج کو موٹر لاریوں پر سوار اور مشین گنوں کو نصب کر کے طول طویل فاصلوں پر دشمن کے علاقوں یا فوجی دستوں پر حملے کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ یعنی زرہ پوش موٹر گاڑیاں نہ صرف ایجاد ہو چکی تھیں۔ بلکہ جنگ میں نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال میں لائی جا چکی تھیں۔ گھوڑے کے تفوق اور اس کے استعمال کے صحیح معنی یہ تھے کہ اس کی وجہ سے پیدل سپاہی کے مقابلہ میں سوار تیز رفتار بھی ہوتا تھا اور طویل مسافت بغیر تکان۔ طے کر سکتا تھا۔ اور چونکہ مشین یہ خدمت گھوڑے سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے انجام دے سکتی تھی لہٰذا گھوڑے کی جگہ بلاتامل مشین کو دے دی گئی۔

۱۹۱۷ء میں جب فریقین جنگ یورپی مورچوں میں ایک دوسرے کے مقابل جم کر بیٹھ گئے اور مشین گنوں کی گولیوں کی بوچھاڑ نے پیدل فوج کی نقل و حرکت کو انتہائی خطرناک بنا دیا اور ایک ایک حملہ میں ہزاروں سپاہیوں کی جانیں تلف ہونے لگیں تو مشین گنوں کا جواب اس کو تباہ کرنے والی مشین سے دیا گیا اور برطانوی فوج کے ایک افسر کرنل سوئنٹن (Swinton) نے ایک ایسی مشین ایجاد کی جو چار میل فی گھنٹہ کی

رفتار سے چل سکتی تھی اور مورچوں کے اوپر سے پھلانگ سکتی تھی۔ اس کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لیئے اس کا نام ٹینک رکھا گیا جو اس کا مستقل نام ہو گیا اور آج بھی یہ اسی نام سے مشہور ہے۔

اس مشین یا ٹینک کو برطانوی فوج نے پہلی مرتبہ کامیابی کے ساتھ جرمنی کے آہنی دفاعی خط ہنڈنبرگ لائن (Hindenburg Line) کے خلاف استعمال کیا۔ یہ خط یا مورچہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ یکے بعد دیگرے تین خندقیں تھیں اور ہر خندق کے سامنے پچاس گز تک خاردار تار نہایت مضبوطی سے لگائے گئے تھے۔ جن کے اندر سیمنٹ کے بنے ہوئے نہایت مضبوط چھوٹے چھوٹے قلعے تھے۔ اس کے علاوہ مورچہ کی قدرتی رکاوٹیں ایسکوٹ نہر (Del'escaut) اور گرینڈ ریوین (Grand Ravine) کا قدرتی نالہ تھا۔ خندقوں کی چوڑائی ۱۸ فٹ کے قریب تھی۔ مگر نو ایجاد برطانوی ٹینک صرف دس فٹ چوڑی خندق کو پھلانگ سکتا تھا۔ اس لیئے یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس خط کو کس طرح توڑا گیا۔

اس حملہ میں برطانوی فوج نے ۳۸۰ ٹینک استعمال کیئے اور ان کی مدد کے لیئے ایک ہزار سے زیادہ بھاری قسم کی توپیں کام میں لائی گئیں۔ ہراول میں تین تین ٹینکوں کی ٹولیاں تھیں۔ ہر ٹولی کے اگلے ٹینک کا کام یہ تھا کہ خاردار تار کو کچل کر اور پہلے مورچہ کے نزدیک پہنچ کر بائیں طرف مڑ جانا اور ساری خندق پر گولیوں کی بارش کرنا۔ دوسرا ٹینک آگے بڑھ کر اور خندق کے اندر فیسن (Fascine) پھینک کر اس کی مدد سے مورچہ کے پار اُتر جانا۔ فیسن ہلکی قسم کی ایک ایسی چیز تھی جو خندق کے اندر گر کر اُسے پُر کر دیتی اور اتنی مضبوط تھی کہ ٹینک اس پر سے چل کر خندق کو پار کر جاتا۔ جب پہلا ٹینک خندق پار کر لیتا تو دوسرا دشمن پر گولہ باری کر کے اس کی مدد کرتا اور تیسرا فیسن پر سے گزر کر سیدھا دوسری خندق کی طرف بڑھتا اور حفاظتی تار کو روندتا ہوا پہلے ٹینک کی طرح دوسری خندق پر گولہ باری کرتا۔ اس وقت پہلا ٹینک جو پہلی خندق کے پاس ٹھہر گیا ہوتا آگے بڑھ کر دوسری خندق میں فیسن پھینکتا اور اس کو پار کر لیتا۔ چونکہ جرمنوں کو اس ٹینک کی ایجاد کا علم نہ تھا۔ لہٰذا حملہ نہایت کامیاب رہا۔ مگر اس کے باوجود برطانیہ نے اس ایجاد کی قدر نہ کی۔ اور جنگ کے بعد اس کی ترقی پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔

جنگ کے بعد برطانوی فوج نے مشرق وسطیٰ کے مقبوضات کی شورش اور بغاوت

کو زرہ پوش موٹر گاڑیوں (Armoured cars) اور ہوائی جہازوں کی مدد سے ختم کیا۔

بلجیم اور فرانس کے پیشہ ور جنگی چوروں نے جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں جنگی ادا کئے بغیر سامان لے جاتے تھے۔ ایسی موٹر گاڑیاں ایجاد کیں جو دونوں طرف سے چل سکتی تھیں۔ تاکہ مزاحمت پیش آنے پر بغیر موڑے نہایت آسانی سے اُلٹی چل سکیں اور گرفتار نہ ہو سکیں۔ انہوں نے زرہ پوش گاڑیاں بھی بنائی تھیں۔ جو تیز رفتار ہونے کے علاوہ بہت محفوظ تھیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں امریکہ نے اپنے ایک رسالہ کے گھوڑوں کو زرہ پوش موٹروں سے بدل دیا۔

جرمنی نے ساری دنیا کی حربی ایجادات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے بہت عمدہ ٹینک بنائے جن کی وجہ سے وہ اتنا طاقتور ہوگیا کہ دوسری عالمی جنگ شروع ہوتے ہی سارے یورپ پر چھا گیا۔ فرانس چند روز کے اندر پامال ہوگیا اور چونکہ فرانس میں برطانوی فوجیں اور برطانوی اسلحہ کو بھی شکست ہوئی تھی۔ اس لئے عوام نے اکثر برطانوی جرنیلوں کو اس کا ذمہ وار ٹھہرایا کہ انہوں نے ٹینک کی ایجاد کو فراموش کر دیا اور گھوڑے سے اس قدر دلچسپی لی کہ ملک کی حفاظت کو بھی بھول بیٹھے۔ مگر فی الحقیقت اس کی وجہ یہ نہیں تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ سنہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی لڑائی سے برطانیہ کے خزانے اور اس کی تجارت پر زبردست بار پڑا تھا۔ دنیا کی بہت سی منڈیوں پر امریکہ و جاپان نے قبضہ کر لیا تھا چونکہ اقتصادی بحالی اور تجارتی نقصان کی تلافی کے لئے مصارف میں کمی ضروری تھی اس لئے برطانوی حکومت نے ہر دلعزیز بننے کے لئے بچت کے بجٹ تیار کئے اور فوجی مصارف میں تخفیف کر دی۔ جس کی وجہ سے دوسری جنگی تیاریوں کے ساتھ ایجاد بھی تغافل کی نذر ہوگئی۔ اگرچہ برطانیہ کے پاس آغاز جنگ میں ٹینکوں کے عمدہ عمدہ نمونے تھے۔ مگر ٹینک تیار نہ تھے۔ جرمنی نے اپنی ساری توجہ اور سارے وسائل مشینی فوج تیار کرنے پر صرف کی تھی۔ اس کے ٹینک بڑے اور مضبوط تھے اور بھاری توپوں سے مسلح، رفتار ۲۵ میل فی گھنٹہ کے قریب تھی۔ برطانیہ اس کے مقابلہ میں جو ٹینک شکن توپ لایا وہ کمزور تھی اور اس کا گولہ صرف دو پونڈ کا تھا۔ لہذا جرمن ٹینکوں کے مقابلہ میں بے کار ثابت ہوئی۔

مگر ۱۹۴۰ء میں ڈنکرک کے واقعہ کے بعد برطانیہ نے زرہ پوش مشینیں بڑی تیزی سے تیار کیں۔ چنانچہ جب اتحادیوں نے یورپ پر دوبارہ حملہ کیا تو فرانس میں ٹیٹرہ (Tetrach) قسم کے ٹینک ہوائی جہازوں سے اتارے۔ ان کے چلانے والے ٹینکوں کے اندر ہوتے۔ چنانچہ جونہی وہ گلائڈروں سے زمین پر اترتے۔ وہ سیدھے دشمن پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو جاتے۔ ہر ٹیٹرہ ٹینک کا وزن ۷½ ٹن اور رفتار ۲۵ میل فی گھنٹہ اور ۲ پونڈ گولے والی توپ یا تین انچ کے ہوٹزر سے مسلح کئے گئے تھے۔ ان میں ایک ایسا آلہ بھی لگایا گیا تھا جس کی مدد سے گولے کی رفتار اور زرہ کو توڑنے کی طاقت بڑھ جاتی تھی۔

دوسری قسم کا ٹینک کروزر (Cruiser) تھا۔ اس کا گولہ ۶ پونڈ وزن کا تھا یا اس پر ۷۵ ملی میٹر دہانے کی توپ لگائی گئی تھی۔ اس کی رفتار ۲۷ میل فی گھنٹہ تھی۔ ویلنٹائن (Valentine) اور کروسیڈر (Crusader) ٹینک بھی اسی قسم کے تھے۔ مگر اب انھیں فرسودہ سمجھا جاتا ہے۔

شرمن ٹینک میں ۷۵ ملی میٹر کی ایسی توپ لگائی گئی تھی جس سے زرہ شکن اور زور سے پھٹنے والے دونوں طرح کے گولے چلائے جا سکتے تھے

شرمن مارک V اس سے زیادہ وزنی تھا کیونکہ اس کی توپ ۱۷ پونڈ کا گولہ چلاتی تھی۔ اس کی رفتار ۳۰ میل فی گھنٹہ تھی۔ اس ٹینک کا دوسرا ساتھی کرامویل ٹینک تھا۔ جو شرمن سے زیادہ تیز رفتار تھا۔ یہ دونوں ٹینک وہی کام کرتے تھے اور اس ذمہ داری کو پورا کرتے تھے جو ماضی میں رسالے پوری کیا کرتے تھے۔ یا سمندر میں کروزر جہاز پوری کرتے ہیں

میدان جنگ میں پلٹن کی مدد کے لئے کومٹ (Comet) ٹینک آیا۔ اس میں ۹۵ ملی میٹر کے دہانہ کا ہوٹزر لگایا گیا تھا۔ حملہ کے وقت بھاری توپ سے امداد کے لئے چرچل ٹینک تیار کیا گیا۔ اس کی توپ ۹۵ ملی میٹر دہانے کی تھی۔ زرہ نہایت مضبوط اور موٹی تھی مگر رفتار صرف ۱۲½ میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہ تھی۔

ان کے علاوہ ضروریات جنگ نے ایک اور ٹینک ایجاد کرایا۔ یہ بھی چرچل ٹینک کی قسم کا تھا۔ اس پر پل کے حصے لے جائے جاتے تھے۔ تاکہ کم سے کم وقت میں ٹینکوں کے گذرنے کے قابل بنائے جا سکیں۔
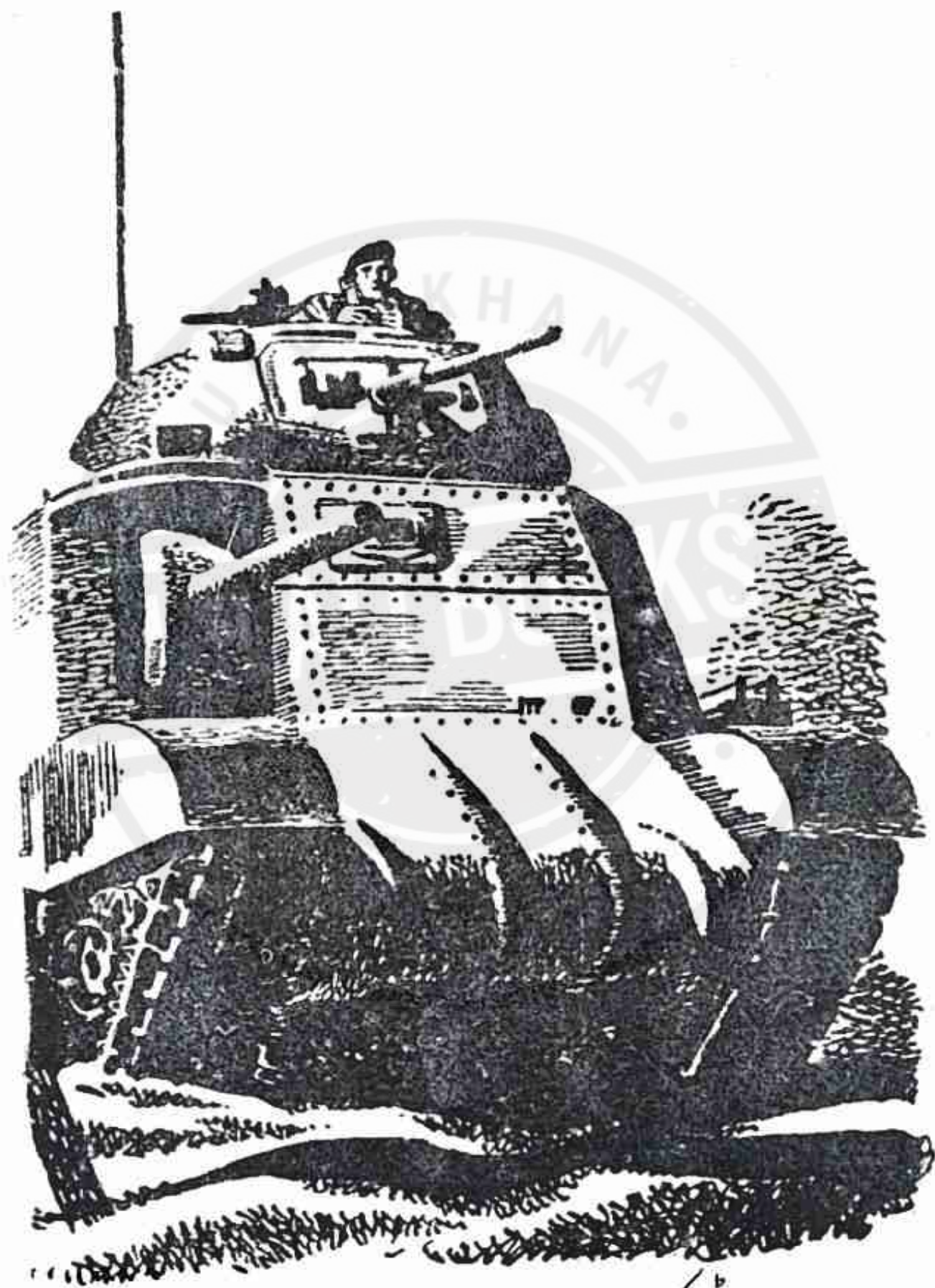
Tank. ٹینک

شرمن ڈی۔ڈی (Sherman D. D.) سمندر اور دریا میں تیر کر بھی چل سکتے تھے اور خشکی پر بھی چل سکتے تھے۔ ان ٹینکوں کو سمندر ہی میں اتار دیا جاتا ہے۔ جہاں سے تیر کر یہ خود ساحل پر آجاتے ہیں۔ اپنی ربڑ کی بیرونی پوشش کو اتار کر الگ کر دیتے ہیں اور دشمن کے ٹینکوں سے لڑنے لگتے ہیں۔ شرمن ڈی ڈی کو (L. C. T) بھی کہتے ہیں یعنی وہ کشتی جس کی مدد سے حملہ آور فوج کو ساحل پر اتارا جاتا ہے

چرچل کرو کو ڈائیل ٹینک سے دشمن پر فلیم تھروئر (Flame Thrower) کی طرح آگ برسائی جا سکتی ہے۔ یہ گویا بہت بڑی قسم کا آگ برسانے والا آلہ ہے۔ اس ٹینک کی وجہ سے ایسے دشمن کو جو مضبوط مورچوں میں قلعہ بند ہو۔ آگ لگنے کی وجہ سے یا تو باہر نکلنا پڑتا ہے یا وہ مورچہ کے اندر جل کر ختم ہو جاتا ہے۔

شروع میں ٹینکوں کے سلسلے میں جرمنی کو فوقیت حاصل رہی۔ لیکن بعد میں اتحادیوں نے بھی کافی ترقی کی اور نئے نئے ٹینک ایجاد کیے۔ لیکن جرمنی بھی خاموش نہیں رہا اور نت نئی ایجادیں کرتا رہا۔ اس کا ٹائیگر جی ماڈل اوّل درجہ کا ٹینک تھا۔ جس کی ۷۵ ملی میٹر کی توپ سے زرہ شکن گولہ چلایا جاتا تھا۔ اور جس کی رفتار ۲۴ میل فی گھنٹہ تھی۔ اس کی زرہ یعنی بیرونی آہنی پوشش بہت وزنی اور مضبوط تھی۔

اس کے مقابلہ میں اتحادیوں نے رائل ٹائگر (Royal Tiger) تیار کیا یہ جرمن ٹائیگر ماڈل جی سے زیادہ طاقتور اور زیادہ وزنی تھا۔ اس کا زرہ شکن گولہ ۲۲ ½ پونڈ کا تھا جو ۳۳۰۰ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتا تھا۔ گویا جرمن ٹائیگر ماڈل جی کے گولے کے مقابلہ میں ۳۰۰ فٹ فی سیکنڈ زیادہ تیز رفتار تھا۔ جرمنی نے اس کے جواب میں پینتھر (Panther) ٹینک بنایا جو رائل ٹائیگر سے کہیں زیادہ تیز رفتار تھا۔ مگر رائیل ٹائیگر دشوار گذار زمین پر چل سکتا تھا۔ وہ اس کی اس خوبی کو نہ پہنچ سکا۔

اس کے بعد جرمنی نے ٹائیگر ماڈل ای بنایا جو وزن میں ۵۶ ٹن اور جسامت میں بہت بڑا تھا اور تنگ راستوں پر نہیں چل سکتا تھا۔

روس کا اسٹالن ٹینک بہت طاقتور اور اعلیٰ قسم کا ٹینک ہے۔ اس کی توپ کا دہانہ پانچ انچ کا ہے اور زرہ ۶ انچ موٹی فولادی چادر کی ہے۔ یہ ٹینک جرمن کاریگروں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ اس نے کوریا میں امریکی ٹینکوں کو زبردست نقصان

پہنچایا ہے۔ روسی ٹینک ۳۴ ٹی بھی بہت کارآمد اور طاقتور ٹینک ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ آیندہ ان میں اور کیا تبدیلیاں کرتے ہیں۔

امریکہ کے پاس روسی ٹینکوں کا جواب شرمن اور پیپیرشنگ ٹینک ہیں۔ کیونکہ موجودہ اطلاع کے مطابق ان کی زرہ زیادہ موٹی اور مضبوط ہے اور توپ ۸۶ ملی میٹر کی ہے۔ یہ ٹینک زیادہ اونچے نہیں۔ بلکہ پست قد ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ دلدل اور ریتیلی زمین پر سے گذرنے میں کارآمد ہیں۔ ان کا وزن ۲۹ ٹن سے کم ہے۔ مگر چوڑائی زیادہ ہے۔ جس کی وجہ سے تنگ گلیوں میں آسانی کے ساتھ نہیں گذر سکتے۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ آج نے کل سے اور موجودہ نے گذشتہ سے کیا سبق لیا ہے اور اس سوال کا جواب کیا ہے کہ کیا مشین نے گھوڑے کی جگہ لے لی ہے؟ اب تک ہم نے صرف اثباتی پہلو پر بحث کی ہے۔ منفی پر کچھ نہیں لکھا۔ لہذا آگے بڑھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بھی کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۵ء کی عالمی جنگ میں جرمنی نے روس پر جو حملے کیئے۔ ان میں جنگی مشین پر موسمی اثرات کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ مثلاً گرمی کے موسم میں جتنے حملے کیئے گئے۔ ان میں جرمنوں کی کامیابی ہوئی۔ مگر جیسے ہی سردی شروع ہوئی اور برف و بارش نے زمین کو دلدل اور فضا کو دھندلا اور کہر آلود بنا دیا۔ جرمن ٹینک چلنے سے معذور ہو گئے۔ اور نقل و حرکت اور باربرداری بہت مشکل ہو گئی۔ ادھر ٹینک معطل ہوئے اور ادھر فضا میں کہر کی وجہ سے جہازوں کی پرواز کم ہو گئی۔ جرمنوں کی ان مشکلات سے فایدہ اٹھا کر ہزارہا کی تعداد میں اسپ سوار قازقوں نے جرمنوں پر پے بہ پے حملے شروع کر دیئے اور ان پر ایسی ضرب لگائی کہ بالآخر جرمن فوج کو منہ کی کھا کر پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ اگر ہماری اطلاعات درست ہیں تو اس وقت بھی روس کے پاس کئی ہزار اسپ سوار ملازم ہیں۔

کوریا میں بلاشبہ فریقین مشینوں ہی کے مدد سے جنگ لڑتے رہے مگر سارا دارومدار مشینوں پر ہی نہیں۔ گھوڑے بھی استعمال ہوتے رہے۔ کوہستانی علاقوں میں باربرداری کا کام انہی سے لیا جا رہا ہے۔ سنگاپور کی برطانوی فوجوں نے بھی گھوڑے اور خچر کی باربرداری کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ کشمیر کی جنگ آزادی میں آزاد کشمیر اور ہندوستان دونوں نے گھوڑوں کی باربرداری سے کام لیا
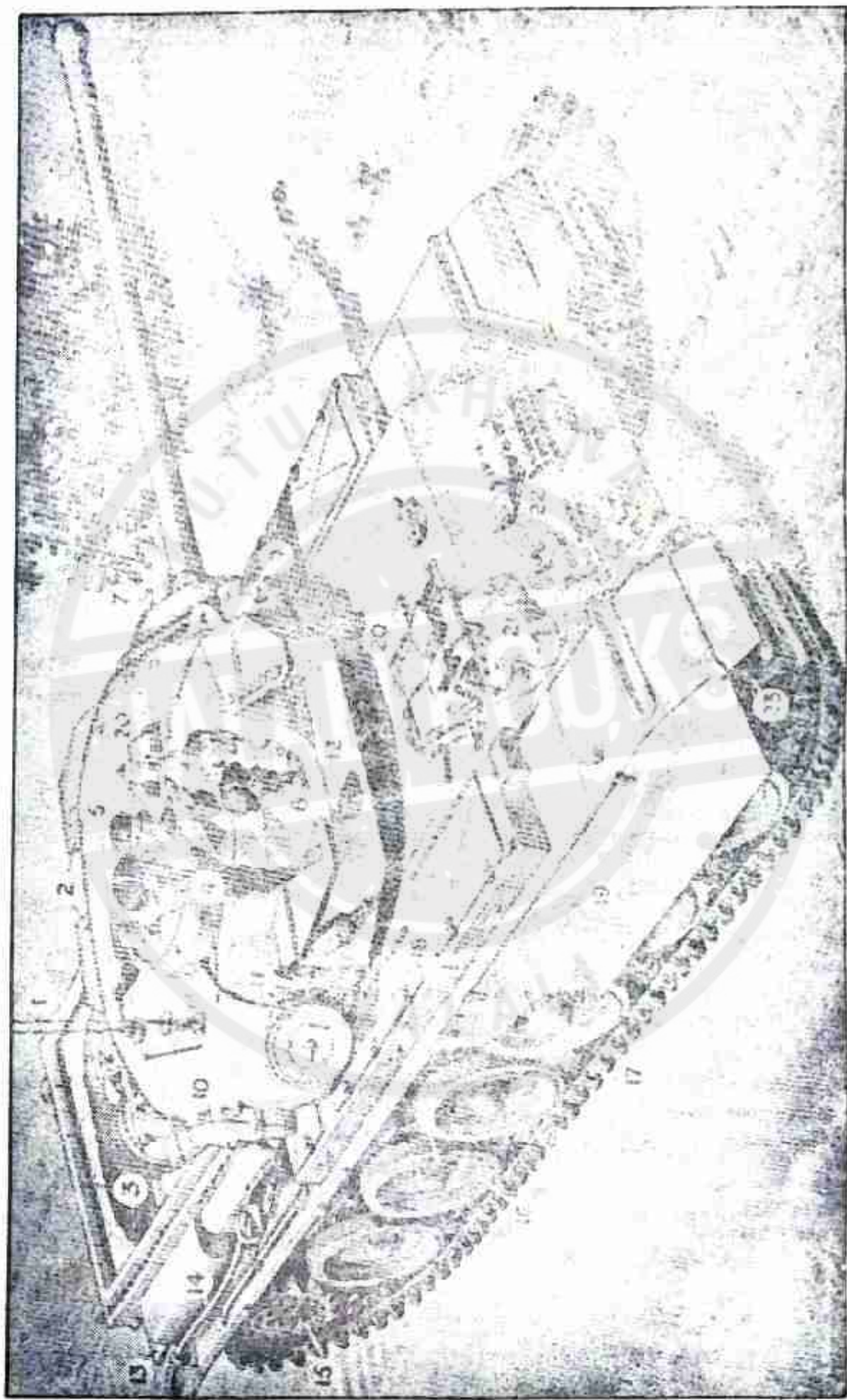
Centurion Tank

برطانوی سینٹورین ٹینک

روسی ترکستان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں ابھی تک روسی رسالہ کئی ہزار کی تعداد میں موجود ہے۔ ان شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ گو رسالے کا استعمال بہت کم ہو گیا ہے۔ مگر پھر بھی اس کی ضرورت باقی ہے۔ لیکن ہمارا مقصد یہ دکھانا نہیں ہے کہ گھوڑا ضروری ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ فن حرب میں گھوڑے کے استعمال نے جو انقلاب عظیم برپا کیا تھا۔ وہ آج بھی موجود ہے یا نہیں اور اس اصول حرب کو اب بھی کام میں لایا جا رہا ہے یا نہیں اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اب رسالے میں بجائے گھوڑے کے عموماً مشین کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر اصول استعمال وہی ہے جو پہلے تھا مثال کے طور پر:-

۱۔ دور سے دشمن کی دیکھ بھال کے لئے اب گھوڑے کے رسالے کے بجائے ہوائی جہاز اور زرہ پوش موٹر گاڑیاں (Armoured Cars) یا ہلکے ٹینک کام میں لائے جاتے ہیں۔ زرہ پوش موٹر گاڑی کی مدد کے لئے کروزر ٹینک لایا گیا ہے جس کا کام ہر لڑائی کے آغاز میں دشمن کی حفاظتی آڑ کو توڑ کر یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں کہاں اور کس کس سمت سے آ رہا ہے۔ لہٰذا دشمن زرہ پوش موٹر گاڑیوں کو جہاں کہیں آگے بڑھنے یا خبر رسانی کرنے سے روکتا ہے۔ کروزر ٹینک ان کی مدد کر کے انہیں آگے بڑھنے کا موقع دیتے ہیں یا خود آگے بڑھ کر دشمن کے ہراول کو اس وقت تک روکے رکھتے ہیں۔ جب تک اپنی فوج کا بڑا حصہ دشمن کے مقابلہ پر نہیں پہنچ جاتا۔ آج کل کے بہترین ٹینک برطانوی سینٹورین (Centurion) اور امریکی ٹینک پیٹن (Patton) ہیں۔ روس کے پاس اس قسم کا ٹینک T ۳۴ ہے

مگر میدان جنگ میں دونوں طرف کی فوجیں جب ایک دوسرے کے قریب آ جاتی ہیں تو اس وقت ایسے ٹینکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کا گولہ بہت وزنی اور دور مار ہو۔ ان کی زرہ بھی مضبوط ہونی ضروری ہے۔ یہ دونوں چیزیں اوسط قسم کے ٹینک یعنی کروزر سے مہیا نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ ان کا کام یہ ہے کہ طویل فاصلے کم سے کم وقت میں طے کریں اور دشوار گذار علاقوں میں جا سکیں۔ پھر کروزر ٹینک بھی ملک کے حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر میدان جنگ ریگستانی ہے تو کروزر ٹینک میں ایسی خصوصیتیں ہونی ضروری ہیں کہ وہ ریگستان میں آسانی سے چل سکیں اور گرم موسم میں چلانے والے آرام سے سفر کر سکیں۔ بھاری قسم کے

ٹینک جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ لائیل ٹائیگہ اور اسٹالن ٹینک ہیں۔

مگر اس قوت وطاقت اور وزن وجسامت کے باوجود اس کو تباہ کرنے والے حربے بھی موجود ہیں۔ اوپر سے ہوائی جہازوں کی بمباری اور زمین پر دشمن کی سرنگیں۔ یعنی جب دشمن کے حملے کا خطرہ ہوتا ہے تو اُن مقامات پر جہاں سے اس کے آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سرنگیں بچھادی جاتی ہیں۔ یہ کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ بعض سے صرف انسانی جان کے نقصان کا احتمال ہوتا ہے۔ بعض سے ہلکے قسم کے ٹینک موٹر لاریاں اور زرہ پوش گاڑیاں تباہ ہوجاتی ہیں ان سے زیادہ طاقتور سرنگیں (Minec) وہ ہوتی ہیں جو ہر قسم کے ٹینک کو تباہ کر سکتی ہیں۔ اس لئے ہر فوج کے ساتھ اب ایسے سپاہی رکھے جاتے ہیں جو باقی فوج سے آگے چل کر سرنگوں کا پتہ لگاتے اور رستوں کو صاف کرتے ہیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایک ٹینک شرمن کریب (Crab) بنایا گیا ہے جسے اتحادیوں نے یورپ کے دوسرے حملے میں استعمال کیا تھا۔ اسی طرح نئے نئے قسم کے ٹینک برابر تیار ہو رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ مگر ان کی قسمیں حسب ذیل ہی ہوں گی :۔

۱۔ آرمی ٹینک (Army Tank) ان کی زرہ بہت موٹی اور وزنی ہوگی تاکہ چھوٹے ہتھیاروں اور چھوٹی قسم کی زرہ شکن توپوں کے گولوں کے اثر سے محفوظ رہیں۔ یہ ٹینک بہت بھاری ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی رفتار کم ہوتی ہے۔ ان کا اسلحہ یعنی توپیں وغیرہ وزنی ہوتی ہیں۔ یہ سخت دھماکے سے پھٹنے والے ہوئٹسرز قسم کے گولے، گیس اور دھوئیں کے گولے چلا سکتے ہیں۔ یہ ٹینک انجینئروں کے کام بھی آتے ہیں اور دشوار گذار علاقہ میں آسانی سے چل سکتے ہیں۔

۲۔ کروزر (Cruiser) قسم کے ٹینک۔ ان کی زرہ آرمی ٹینک سے ہلکی ہوتی ہے۔ مگر ان کی رفتار زیادہ ہوتی ہے۔ ہتھیار قریب قریب یکساں ہوتے ہیں۔

۳۔ لائٹ یعنی ہلکے ٹینک (Light Tank) یہ طویل فاصلے طے کرنے اور زیادہ دیر تک چلتے رہنے کے قابل بنائے جاتے ہیں۔ انھیں عام طور پر دشوار گذار علاقوں میں دشمن کی دیکھ بھال کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز

ایسی فوجوں پر حملہ کرنے کے لئے کام میں لایا جاتا ہے۔ جیسے پلٹن اور بار برداری کی لاریاں وغیرہ۔ جو ٹینک زرہ پوش نہیں ہوتے۔ ان کے ہتھیار بھاری گولے چلانے کے قابل نہیں ہوتے۔

۴۔ زرہ پوش موٹر گاڑیاں (Armoured Car) یہ اس علاقہ میں استعمال کی جاتی ہیں۔ جہاں سڑکیں موجود ہوں اور علاقہ دشوار گذار نہ ہو۔ ان موٹر گاڑیوں کی زرہ ہلکی ہوتی ہے۔ ان کے ہتھیار یا تو مشین گنیں ہوتی ہیں۔ یا ہلکی قسم کی تیز رفتار سے چلنے والی توپیں (Q. F. Guns) یہ طویل فاصلے طے کر سکتی ہیں ؛

توپ خانہ اور دنیائے اسلام

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توپ خانہ کی ایجاد حضرت عیسٰی علیہ السلام سے بھی پہلے ہوئی کیونکہ انجیل میں ایسے آلات کا ذکر ملتا ہے "جن کی مدد سے عیار آدمی دوسروں پر تیر اور پتھر پھینکتے ہیں" گوپیا کا استعمال قدیم سے چلا آرہا ہے اور آج کل بھی باغبان باغوں میں پھلوں کی حفاظت کے لئے اسے استعمال کرتے ہیں۔ آنحضرت ؐ کے غزوات سے مدتوں پہلے اہلِ عرب ایسے آلات حرب استعمال کرتے تھے۔ جن سے دشمنوں کے قلعوں کو مسمار کیا جاتا تھا، اسی طرح محصورین بھی دفاع و تحفظ کے لئے ایسے ہی آلات سے کام لیتے تھے۔ مثلاً حملہ آوروں پر آتشیں گولے اور بڑے بڑے پتھر پھینکے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں سکندر کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نے اس قسم کے کتنے ہی آلات تیار کرا کے استعمال کئے۔

توپ خانہ کے سلسلے میں ترک شہنشاہ محمد ثانی کا نام نہایت عزت سے لیا جاتا ہے اور ماہرین فن انہیں اس فن کا امام سمجھتے ہیں۔ محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے ایسی توپیں بنوائی تھیں۔ جن کے گولے وزن میں تقریباً ۱۹ من، دہانہ ۲۵ انچ، اور نال کی لمبائی ۷ فٹ تھی۔ اس زمانہ میں قسطنطنیہ کا قلعہ دنیا کا مضبوط ترین قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے فتح ہونے سے فن دفاع میں انقلاب آگیا اور

دنیا کے دفاعی مبصرین کی نظریں اس نئے آلے پر لگ گئیں۔
کہتے ہیں کہ ۱۸۰۷ء میں جب برطانیہ نے ترکوں کے خلاف قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو انہیں توپوں میں سے ایک کا گولہ برطانوی بیڑے کے امیرالبحر کے جہاز کے مستول پر لگا۔ جس سے اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس توپ کا گولہ کتنی رفتار اور طاقت رکھتا تھا۔ اس زمانہ میں جنگی جہازوں کے مستول نہایت مضبوط لکڑی کے بنائے جاتے تھے۔ تاکہ تند سے تند طوفانوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ان توپوں کا چلانا بڑا مشکل کام تھا۔ ایک دفعہ چلانے میں قریب قریب دو گھنٹے صرف ہو جاتے تھے۔ ایک توپ کو دن بھر میں زیادہ سے زیادہ چھ سات دفعہ چلایا جا سکتا تھا۔
محمد ثانی کے بعد بابر کا نام آتا ہے۔ وہ بھی توپ خانہ کے استعمال میں بہت ماہر تھا۔ پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کے خلاف اس کی کامیابی کی وجہ محض توپ خانہ کا صحیح استعمال تھا۔ اس کی توپیں کانسے، تانبے اور لوہے کی بنی ہوئی تھیں۔ اس کا افسر توپ خانہ مصطفےٰ رومی ترک تھا اور سالار توپ خانہ استاد علی۔ اس کی توپیں پہیئے دار گاڑیوں پر رکھی ہوئی نہ تھیں۔ بلکہ انہیں جانوروں کی پیٹھ پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا اور جب چلانا مقصود ہوتا تھا تو اسے پہیوں پر جوڑ کر نصب کر دیا جاتا تھا۔ اس لڑائی میں بابر کی فوج تعداد کے اعتبار سے ابراہیم لودھی کی فوج کے چوتھائی حصہ سے بھی کم تھی۔ ابراہیم کے پاس ہاتھی اور دوسرا سامان حرب بہت زیادہ تھا۔ مگر بقول بابر وہ فن حرب سے بالکل نابلد تھا۔ بابر نے اپنے دفاعی منصوبہ سے ایسی چال چلی کہ ابراہیم نے اس پر حملہ میں پیش قدمی کی۔ جب اس نے حملہ کیا تو بابر نہایت ہوشیاری سے اس کی فوج کو اپنے توپوں کے مورچے کے سامنے لے آیا۔ ابراہیم کو اس کا علم نہ تھا اور نہ یہ پتہ تھا۔ کہ ان کی مار ایک میل تک ہے۔ جونہی اس کی فوج منصوبہ کے مطابق مقررہ جگہ پر آئی بابر کے توپ خانہ نے گولہ باری شروع کر دی۔ جس سے سخت نقصان جان ہوا۔ پندرہ ہزار آدمی کام آئے۔ خود ابراہیم مارا گیا۔ اسی پانی پت کے میدان میں دو سو برس بعد ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ دُرّانی نے اپنے وزیر شاہ ولی کو نئی قسم کی توپ بنانے کا حکم دیا۔ یہ توپ مرکب دھاتوں سے تیار کی گئی۔ اس کا گولہ آہنی ہوتا تھا۔ اس کا نام زمزمہ رکھا گیا۔ ۱۷۶۱ء کی پانی پت کی لڑائی میں احمد شاہ نے مرہٹوں کے خلاف اس قسم

کی توپوں کو ایسی ہوشیاری سے استعمال کیا کہ مرہٹوں کی قوت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ یہ توپیں دوسری توپوں کے مقابلہ میں متحرک تھیں۔ زمزمہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ساٹھ برس تک کام دیا اور آخر کار ۱۸۴۷ء میں ملتان کی لڑائی میں بیکار ہوگئی۔ آجکل لاہور کے عجائب خانہ کے سامنے رکھی ہوئی ہے اور مسلم دنیا کی بے پروائی و کوتہ بینی کی شکوہ کناں ہے۔

یہ مثالیں صرف اسلامی دنیا کی ہیں۔ لیکن بے انصافی ہوگی اگر یہ نہ بتایا جائے کہ ہندوستان بابر سے صدیوں پہلے گولہ اندازی کے فن سے واقف تھا۔ یورپ میں سکندر اعظم کو توپ خانہ کا استاد کہا جاسکتا ہے۔ مگر ہندوستان میں اس کا استعمال مہابھارت کے زمانہ سے بھی پہلے ہوا۔ آپس کی پھوٹ کی وجہ سے وہ بیرونی اقوام کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہ ہوئے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انہوں نے آلاتِ حرب ایجاد نہیں کئے۔ جب پندرھویں صدی میں ٹرکی کے محمد ثانی نے اپنے توپ خانہ سے یورپ کو تہ و بالا کیا اور بابر ہندوستان کی طرف بڑھا۔ اس وقت یورپ کی حیثیت طفل مکتب کی سی تھی۔ مگر یہ طفل مکتب بہت جلد ہوشیار اور جوان بن گیا اور اپنی حکمت عملی اور بصیرت و دانائی سے ایسا کام لیا کہ دنیا کا رہنما بن گیا۔

ہم زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ اس لئے اپنے بیان کو انڈین آرمی کے توپ خانہ کے جدامجد برٹش آرٹلری تک محدود رکھیں گے۔

آرٹلری فرانسیسی لفظ (Artiller) سے بنا ہے جس کے معنی ہیں آلاتِ حرب سے آراستہ کرنا۔ چونکہ پاکستان کا توپ خانہ بعینہ برطانوی توپ خانہ کی نقل ہے اور ہماری توپیں اور گولے زیادہ تر برطانیہ ہی سے آتے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وضاحت کے لئے برٹش آرٹلری کی مختصر تاریخ بیان کر دی جائے۔

۱۷۱۶ء سے قبل برطانیہ کے توپچی فوج کے باقاعدہ ملازم نہ ہوتے تھے۔ بلکہ سول ملازم سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ ان کے لئے جسمانی صحت اور عمر وغیرہ کی کوئی قید نہ تھی۔ لہٰذا موت ہی ان کو ملازمت سے علیحدہ کرتی تھی۔ ۱۷۹۶ء تک یہی صورت رہی۔ ۱۷۹۶ء میں یورپ کے دوسرے ملکوں کے مطابق برطانیہ نے بھی اپنے اسلحہ میں بڑی توپیں شامل کیں اور اس طرح اس کے پاس تین پونڈ سے لے کر ۲۴ پونڈ کے گولے تک کی توپیں ہوگئیں۔

توپ خانے کے اعتبار سے فرانس باقی یوری اقوام سے بہت آگے تھا۔ نپولین نے ایک خاص قسم کا کارتوس گولہ تیار کیا۔ وہ اپنی توپوں کو گھوڑوں کے ذریعہ کھچوا کر دشمن کے قریب لے جاتا اور فی الفور گولہ باری شروع کر دیتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ دوسرے ملکوں کی توپوں کی طرح نپولین کی توپوں کو چلانے سے فوراً قبل بھرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ بلکہ گولے بھری ہوئی توپیں ایک مورچہ سے دوسرے مورچہ پر لے جائی جاتی تھیں۔ یہ ایک فرق ضرور تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مدت تک توپ یا اس کے گولے کی ساخت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد امریکہ میں جنگ آزادی چھڑی تو اس میں ایسی بندوق تیار کی گئی۔ جس کی نالی کے اندر چھلے (Grooves) تھے۔ اس کا نام رائفل رکھا گیا۔ اس کی ایجاد سے توپ بیکار ہو گئی۔ کیونکہ رائفل کی گولی کی مار توپ کے گولہ کی مار سے کہیں زیادہ تھی۔ جرمنی کے فوجی انجینئروں نے رائفل کے جواب میں توپ کی نال میں بھی چھلے (Grooves) ڈالے اور اس کی مدد سے جرمن فوج نے ۱۸۷۰ء میں فرانس کو شکست فاش دی۔

ابھی انیسویں صدی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور توپ بنائی گئی جو بڑی تیز رفتاری سے گولہ چلا سکتی تھی۔ چونکہ اس میں بارود کے دھماکے پر قابو رکھنے کے لئے بڑا سا اسپرنگ لگایا گیا تھا۔ لہٰذا اسے آگے بڑھا کر بار بار نشانہ پر لگانے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹانے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر یہ زیادہ مفید اس وقت ہوئی۔ جب بغیر دھوئیں کی بارود ایجاد ہو گئی۔ اس بارود سے یہ بھی ممکن ہو گیا کہ توپچیوں کی حفاظت کے لئے لوہے وغیرہ کی روک بنائی جا سکے۔ چنانچہ اس سے توپچی دشمن کی گولہ باری کی زد سے بڑی حد تک محفوظ ہو گئے۔ یہ گویا توپچیوں کی ڈھال تھی۔

ان اضافوں اور ترقیوں کے بعد توپ کی ساخت میں عرصہ تک کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ اس کے گولے کی بناوٹ میں کتنے ہی تغیر ہوئے۔ مثلاً پہلے وہ گولہ بنایا گیا جو نشانہ پر پہنچ کر پھٹ جاتا تھا اور کئی ٹکڑے ہو جاتے تھے اس سے گولہ کی زد کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اس کے کچھ دن بعد ۱۹۰۰ء میں ایسا گولہ ایجاد ہوا جسے کسی آڑ کے پیچھے چھپے ہوئے دشمن کے خلاف کارگر طریقہ پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جس توپ سے یہ گولہ چلایا جاتا تھا۔ اس کا نام ہوئٹزر گن رکھا گیا۔ یہ بھی بھاری قسم کی توپ تھی۔
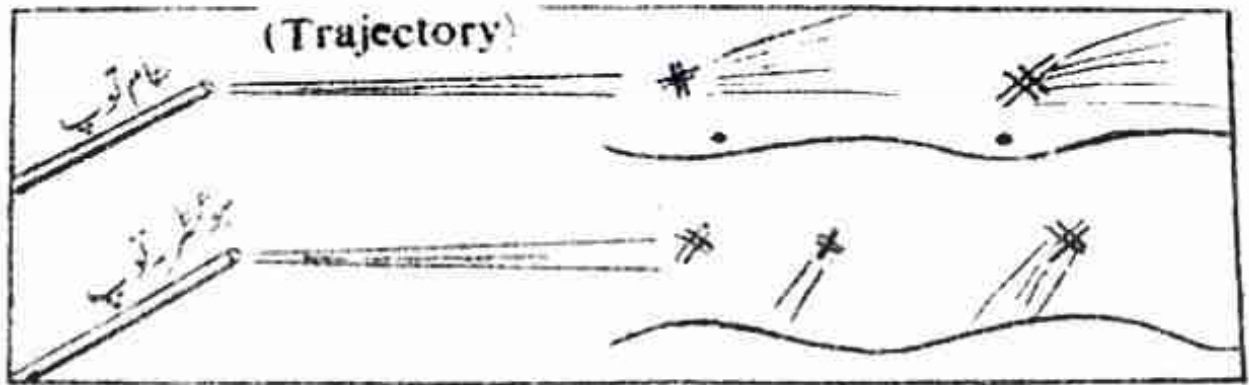
اس کے دو تین سال کے اندر ہی انجنیروں نے ایسی ہوئٹزر توپیں بنائیں جو وزن میں ہلکی تھیں اور جنھیں پیدل فوج اور رسالے اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔

انڈین آرٹلری

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ۱۶۴۲ء میں ہندوستانی توپ خانہ کو یورپی توپ خانہ کے اصولوں پر ترتیب دینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۶۲۸ء میں امرگاؤں میں بارہ توپیں تھیں جن کے چلانے کے لئے ۲۸ نفر توپچی تھے جو پلٹن کے سپاہی تھے۔ انہیں توپ چلانے کا کام سکھایا گیا تھا۔ ۱۶۷۳ء میں بمبئی کے قلعہ میں ۲۱ توپیں تھیں۔ مگر لنڈنی صرف دو تھے۔ مگر جب ضرورت ہوتی تھی تو جہازوں سے بحری سپاہی بلا لئے جاتے تھے مگر چونکہ بحری کپتان اپنے قابل سپاہیوں کو اس کام کے لئے بھیجنے میں پس و پیش کرتے تھے۔ اس لئے یہاں بھی پلٹن کے سپاہیوں کو توپ چلانے کی تربیت دی گئی۔ اس کے بعد بنگال اور مدراس میں بھی ایسا ہی ہوا۔

ہندوستانی گولہ انداز جنہیں توپچی یا گنر (Gunner) کہا جاتا تھا۔ صحیح نشانہ لگانے اور ہمت و جوانمردی میں مشہور تھے۔ سب سے پہلے انہیں فرانسیسیوں نے اپنے یہاں نوکر رکھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو ان کی خدمت کا علم ہوا تو اس نے بھی ان کو ملازم رکھنا شروع کر دیا۔ اگرچہ توپ خانہ کا عملہ زیادہ تر انگریزوں ہی پر مشتمل ہوتا تھا۔ مگر غدر یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے بنگال رجمنٹ میں ہندوستانی توپ خانہ کی جسے (Native) آرٹلری بنگال رجمنٹ کہا جاتا تھا تین بٹالین رجمنٹیں) تھیں۔ مدراس آرٹلری رجمنٹ اور بمبئی آرٹلری رجمنٹ میں صرف ایک بٹالین نیٹو آرٹلری (Native Artillery) کی تھی۔ ہارس آرٹلری بریگیڈ (Horse Artillery Brigade) میں بنگال کے اندر تین اور بمبئی و مدراس میں ایک ایک ٹروپ تھا۔ بنگال کے توپچی

یوپی کے پانڈے، کاشتکار برہمن یا راجپوت نسل کے تھے۔ پنجاب میں چار ماؤنٹین (پہاڑی) بیٹریاں تھیں اور ایک گیریزن (Garrison) بیٹری ایسی تھی جس میں پنجابی تھے۔

ہندوستان کی آرٹلری رجمنٹ اور برطانیہ کی ملٹری رجمنٹ میں ترتیب یا اسلحہ کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہ تھا۔ البتہ گیریزن بیٹری میں بجائے گھوڑوں کے بیل استعمال کیئے جاتے تھے۔

اس کے بعد ۱۸۴۳ء میں بمبئی میں نمبر ۱۰ کمپنی گولہ انداز بٹالین بمبئی فورٹ فٹ آرٹلری قائم کی گئی اور ۱۸۶۰ء میں اس کا نام نمبر ۲ کمپنی رکھا گیا۔ ۱۸۷۵ء میں جب یہ کمپنی عدن سے ہندوستان واپس آئی تو اسے جیکب آباد بھیجا گیا۔ اس کے لئے گولہ انداز یا توپچی جیکب رائفلز سے حاصل کیئے جاتے تھے۔ آج کل پاکستان میں اسے ۵/۱ بلوچ رجمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس بیٹری کو ۱۸۸۹ء میں برما بھیجا گیا۔ ۱۸۹۷ء یہ وزیرستان واپس آئی اور آج کل اس کا نام جیکب ماؤنٹین بیٹری ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بنگال آرٹلری کی تمام بٹالینوں اور بیٹریوں نے حصہ لیا۔ ان کے آدمی نہایت بہادری سے لڑ کر موت کے گھاٹ اتر گئے اور اپنی توپوں کے پاس مردہ پائے گئے انگریزوں نے اس کا نام غدر مشہور کیا۔ اس کو فرو کرنے میں مدراس، بمبئی اور پنجاب کے توپ خانوں نے بڑا حصہ لیا۔ جب اس پر قابو پا لیا گیا تو بمبئی گولہ انداز بیٹری اور سندھ خاندیس کی بیٹریوں کے علاوہ تمام نیٹو یعنی ہندوستانی آرٹلری کو توڑ دیا گیا۔ جو بیٹریاں نہ توڑی گئیں وہ محض اس لئے کہ ان کے توپچیوں سے سندھ اور خاندیس میں ماؤنٹین (پہاڑی) توپ خانے برقرار رکھے جا سکیں اور بڑی قسم کے توپ خانوں میں خواہ وہ فیلڈ آرمی کے لئے تھے یا گیریزن یعنی قلعوں کی حفاظت کے لئے صرف انگریز توپچی رکھے گئے۔

ایک اور بھی توپ خانہ تھا جسے نہیں توڑا گیا۔ یہ حیدرآباد کا حیدرآباد کنٹنجنٹ (Hyderabad Contingent) تھا۔ اور اس کی وجہ نظام کی بے مثل وفاداری تھی۔ یہاں عقیدتمندی و وفاداری کے علاوہ کسی پرخاش کے گمان کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

یہ دوسری ضرب تھی جس سے انگریزوں نے ہندوستانیوں کو نہتا کیا۔ پہلی یہ تھی

کہ پلٹن اور رسالے اور ان کے ذمہ دار افسر انگریز ہوں گے اور دوسری یہ کہ ہندوستانیوں کو رائفل کے علاوہ کوئی بڑا ہتھیار چلانے کا موقعہ نہ دیا جائے گا۔ ایک ضرب مادی تھی اور دوسری اخلاقی۔ ذہنیت کی ضرب تعلیم سے دور رکھ کر لگائی گئی تاکہ ہندوستانی احساس کمتری اور کمزوری کا شکار رہیں۔

جس وقت لارڈ کچنر ہندوستان میں کمانڈر انچیف مقرر ہو کر آیا تو اس نے ہندوستانیوں کو اور بھی کمزور بنانے کا منصوبہ بنایا اور اس کا نام انڈین آرمی ریفارم رکھا گیا۔ یہ ریفارم یا اصلاح ۱۹۰۷ء میں شروع ہو کر ۱۹۱۵ء میں ختم ہوئی۔

اس "ریفارم" کے ذریعے ہندوستانی فوج میں بہت بڑی تبدیلیاں کی گئیں جن سے اگرچہ اسے کچھ جدید اسلحہ تو مل گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی فوجی دستوں کا سارا نظام انگریز افسروں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ایک بڑی اور نمایاں تبدیلی یہ ہوئی کہ متحرک میدانی توپ خانہ قطعی طور پر انگریزوں کے لئے مخصوص ہو گیا۔ صرف چند پہاڑی توپ خانے ایسے رکھے گئے۔ جن میں ادنیٰ افسر تو ہندوستانی ہوتے تھے۔ مگر ان میں بھی بڑے افسر انگریز ہی مقرر کئے گئے۔ ہندوستانیوں کی افسرانہ ذمہ داریوں کو ختم کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ان میں تعلیمی و اخلاقی لحاظ سے ان عہدوں کی اہلیت نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ اس "ریفارم" کے بعد ہندوستانی فوج کے ہاتھ میں توپ خانہ برائے نام رہ گیا۔

ان حالات میں ہی ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ چونکہ توپ خانہ تمام تر انگریزی تھا اور ہندوستان میں محض عارضتاً رکھا گیا تھا۔ لہٰذا جنگ چھڑتے ہی تقریباً سارے توپ خانے فرانس کے میدان جنگ میں بھیج دیئے گئے۔ جہاں اتحادیوں کو چند ہی روز کے اندر یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے پاس جرمنی کے مقابلہ میں توپ خانہ بہت ہی کم ہے دوسری طرف فرانس کی لڑائی میں برطانیہ کو پلٹن کا جو نقصان اٹھانا پڑا۔ اس سے بخوبی واضح ہو گیا کہ برطانیہ میں ہر قسم کی فوج کے لئے جوان نہیں مل سکتے۔ لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ فیلڈ آرٹلری (میدانی توپ خانہ) کے گھوڑوں کے ڈرائیور تو ہندوستانی جوان ہوں۔ مگر توپچی انگریز رہیں اور اس طرح جنگ کے ایک نازک دور میں بھی ہندوستانیوں کو اس اہم فن سے نابلد رکھا گیا۔ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کو ان دفاعی معاملات میں کوئی درک نہ تھا اور جنھیں تھا وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے خاموش تھے۔

بہر حال پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں فیلڈ آرٹیلری میں بہت ہی کم تغیر ہوا
سنہ ۱۹۱۴ئہ میں رسالے کی مدد کے لئے ۱۳ پونڈ کے گولے کی توپ تھی۔ مگر پیدل فوج
کی فیلڈ گن کا گولہ ۱۸ پونڈ کا ہوتا تھا۔ چھ توپوں کو چلانے والی جماعت کو بیٹری
(Battery) کہا جاتا تھا۔ فیلڈ گن کی تین بیٹریاں مل کر بریگیڈ بنتی تھیں۔ ہوٹزر
کی دو بیٹریاں ایک بریگیڈ ہوتا تھا۔ لیکن بڑے دہانہ کی دور مار توپ کی بیٹری میں
جس کے گولے کا وزن ۶۰ پونڈ تھا۔ صرف چار توپیں ہوتی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم
میں اس کا نام بریگیڈ تھا۔ آج کل اسے رجمنٹ کہتے ہیں۔

توپ خانہ کی ہر ڈویژن میں فیلڈ آرٹیلری بریگیڈ ۱۸ پونڈ گولہ کی توپ کے
دو بریگیڈ ہوٹزر توپوں کے اور ایک بریگیڈ ۶۰ پونڈ والی توپ پر مشتمل ہوتا تھا۔
فرانسیسیوں کی ۷۵ کی فیلڈ گن برطانیہ کی توپوں سے ہر لحاظ سے بہتر
اور زیادہ کار آمد تھی۔ کیونکہ اس سے ہر قسم کا گولہ چلایا جا سکتا تھا مگر اس کا گولہ
دہانہ سے پرواز کے وقت بالکل سیدھا جاتا تھا۔ جس سے پہاڑ، ٹیلے اور چٹانیں
وغیرہ سد راہ ہوتے تھے۔ لہذا پہاڑ وغیرہ کے عقب میں چھپے ہوئے دشمن پر
گولہ باری کرنے کے لئے ہوٹزر استعمال کرنا پڑتی تھی۔

مورچہ بندی کی لڑائیوں میں جب فرانس کی جنگ کا انداز بدلا تو برطانوی فوج
کو اس کا احساس ہوا کہ اس کی پیادہ فوج کی مدد کے لئے توپ خانہ بہت ناکافی
ہے۔ لہذا بحری بیڑے کی دور مار توپوں کو ریل گاڑیوں پر نصب کر کے کام میں
لایا گیا۔ مگر ان کی ٹریجکٹری (Trajectory) ۱۸ پونڈ والی توپ کی طرح
سیدھی اور بہت کم خم لئے ہوئی تھی۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دشمن
پر چوبیس گھنٹے اتنی سخت وشدید گولہ باری کرنی پڑے گی اور توپوں سے اس
قدر گولے چلانا پڑیں گے۔ مگر اس کے باوجود اس دوران میں توپوں کی ساخت میں
کوئی بڑا فرق نہ ہوا۔ البتہ مختلف قسم کے گولے تیار کئے گئے جنہیں صحیح طریقے سے
استعمال کرنے کے لئے توپ خانے کے حربی اصولوں میں متعدد ترمیمیں ہوئیں۔ مثال کے طور پر
توپ خانہ میں نئے دستے شامل کئے گئے اور اسی سلسلے میں آرٹیلری سروے
(Artillery Survey) وجود میں آیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ مختلف ذرائع سے
دشمن کے توپ کے مورچے کا پتہ لگائے۔ سب سے پہلے دشمن کے توپوں کی آواز سن کر

اس کا پتہ چلایا جاتا تھا اور اس کے بعد اپنی توپوں کو ایسے رخ اور اتنے فاصلہ پر لگایا جاتا تھا کہ انہیں تباہ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کیا جاتا تھا کہ دشمن کی توپ کس دہانہ اور کتنی مار کی ہے۔ اس طریقہ کی ایجاد کا سہرا ایک فرانسیسی افسر توپ خانہ کے سر تھا اور سب سے پہلے اسے ۱۹۱۴ء کے موسم سرما میں استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۱۵ء تک برطانوی فوج میں اس کام کے لئے متعدد دستے متعین کئے گئے اور ان کا نام ساؤنڈ رینجنگ سیکشن (Sound Ranging Section) رکھا گیا

اگرچہ اس طریقہ کا استعمال پیچیدہ ہے۔ مگر اس کے اصولوں کو آسان طریقہ پر اس طرح بیان کر سکتے ہیں مثلاً چھ مائیکروفون ایک ایک ہزار گز کے فاصلہ پر دشمن کے مورچہ کی طرف منہ کر کے رکھ دیئے جاتے ہیں اور تاروں کے ذریعہ ان سب کا تعلق ایک بیٹری کے ذریعہ ساؤنڈ رینجنگ سیکشن سے قائم کر دیا جاتا ہے۔ ہر مائیکروفون میں پلاٹینم کا ایک چھوٹا سا تار لگا ہوا ہے جو بیٹری گرم رکھتا ہے۔ جب پلاٹینم کے ان تاروں پر آواز کا اثر ہوتا ہے تو یہ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور اس سے بجلی کی طاقت میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اس فرق کو گالوانو میٹر (Galvano Meter) کے ذریعہ کاغذ پر درج کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس آلہ کی سوئی کے نیچے ایک خانہ دار کاغذ ہوتا ہے۔ جو بجلی سے چلنے کی وجہ سے برابر حرکت کرتا رہتا ہے۔ جب آواز کی وجہ سے بجلی کی طاقت میں فرق پیدا ہوتا ہے تو سوئی اوپر کو اٹھ جاتی ہے

ا اسے سمجھنے کے لئے ذیل کے نقشہ کو غور سے دیکھئے۔ نصف دائرہ کے اندر چھ مائیکروفون
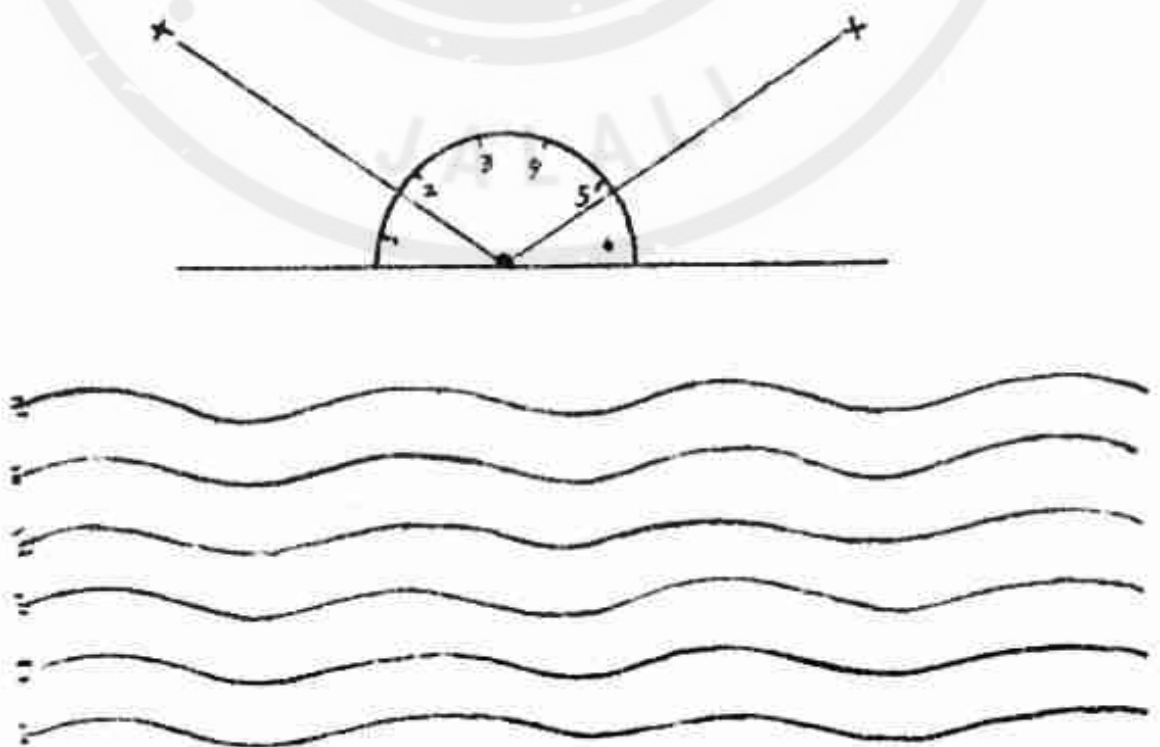
لگے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان توپ خانہ کے دو نگہبان افسر آگے دشمن کے مورچہ کی سمت میں تعینات ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ دشمن کی نقل و حرکت اور اس کے مورچہ پر گولہ باری کرنے کے لئے نشانے تلاش کریں۔ نیز اپنے ہیڈ کوارٹر کو یہ اطلاع دیں۔ کہ اپنی توپوں کے گولے نشانہ پر لگ رہے ہیں یا نہیں۔ فرض کیجئے یہ افسر مائیکروفونوں سے دو میل آگے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ جب دشمن ہمارے مورچہ پر گولہ باری کرے گا تو اس کی توپوں کی آواز سب سے پہلے ان کو سنائی دے گی۔ لہذا یہ آواز سنتے ہی ایک سوئچ (Switch) کو دباتے ہیں۔ اس کے دبتے ہی گالوینومیٹر (Galvano Meter) چلنے لگتا ہے اور توپ کی آواز جیسے ہی مائیکروفون میں پہنچتی ہے۔ وہ اسے کاغذ پر ریکارڈ کر دیتا ہے اور اس وقت تک کرتا رہتا ہے۔ جب تک یہ افسر سوئچ کو دبائے رکھتے ہیں۔ اس طرح ایک تو وہ آوازیں جن کا ریکارڈ کرنا بیکار ہے۔ کاغذ پر درج نہیں ہوتیں۔ دوسرے کاغذ بیکار خرچ نہیں ہوتا۔

آواز کی رفتار کا انحصار، ہوا کی رفتار، اس کے رخ اور موسم کے گرم سرد ہونے پر ہوتا ہے۔ لہذا جب ہوا ناموافق ہوتی ہے تو یہ آلہ صحیح طور پر کام نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں دوسرے طریقے کام میں لائے جاتے ہیں۔ مثلاً گولہ چلتے وقت بارود سے جو چمک پیدا ہوتی ہے۔ اس سے فاصلے کا اندازہ کیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ چمک کے کتنے لمحے بعد آواز سنائی دی۔ ان طریقوں سے دشمن کی توپوں کے مورچے کے فاصلہ کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

یہ اس آلہ کے طریق کار کے ابتدائی سائنسی اصول تھے۔ مگر اب دوسرے مؤثر تر آلے بن چکے ہیں اور ان میں بہتر اصولوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جن کی وجہ سے آرٹلری سروے سیکشن کا کام بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اب دشمن کے مورچہ، اس کی توپوں کی جگہ، ان کی سمت اور فاصلہ باقاعدہ ایک نقشہ پر پلاٹ کر لیا جاتا ہے۔ پھر اس کی مدد سے اپنی توپیں دشمن سے میلوں دور نشانہ کو دیکھے بغیر صحیح اور مؤثر فائر کر سکتی ہیں۔ ورنہ پہلے دشمن کے مورچے کا فاصلہ اور سمت معلوم کرنے کے بعد آزمائش کے طور پر چند گولے پھینکے جاتے تھے۔ اس کے بعد نگہبان افسر ٹیلی فون یا وائرلیس کی مدد سے اپنے توپچیوں کو خبر دیتے تھے کہ یہ گولے نشانہ پر لگے یا نہیں۔ اس طرح آزمائشی گولے چلانے سے دشمن کو بھی ہماری توپوں کے مورچہ کی اطلاع ہو جاتی تھی

مگر جدید طریقہ سے آزمائشی گولہ اندازی (Registration Fire) کے بغیر ہی یا صرف چند گولے پھینکنے کے بعد ہی کارگر گولہ باری کی جا سکتی ہے۔

گویا توپ خانہ میں اس نئے دستے کی شمولیت سے شعلے کی چمک، آواز اور نگہبان افسروں کی دوربین کی مدد کے بغیر دُور سے دشمن پر موثر فائر کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۱۸ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان برطانیہ نے اپنی ۱۸، ۱۳ اور ۳ پونڈ والی توپوں کو ناقص قرار دے کر ۲۵ پونڈ کی نئی توپ ایجاد کی۔ اس میں حسب ضرورت عام یا ہوٹنرز قسم کے گولے چلائے جا سکتے ہیں۔ جیسے قلعہ شکن، آدم کُش اور ٹینک شکن وغیرہ۔ اس توپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے چاروں طرف گولے برسائے جا سکتے ہیں۔ اس کے مورچہ کو بار بار بدلنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

جرمنی نے بھی ۱۹۳۹ء کی جنگ میں اس قسم کی توپ استعمال کی تھی۔ اس میں بھی ہر قسم کے گولے چلائے جا سکتے تھے۔ اس کا دہانہ دس سنٹی میٹر کا تھا۔ لیکن اس نے چھوٹی قسم کی اور توپیں بھی بنائیں جنھیں اس کی پیدل فوج کا سپاہی چلاتا تھا۔ اس کا نام مارٹر (Mortar) تھا۔ اسے دوسری جنگ میں اتحادیوں کے خلاف بہت موثر طریق پر استعمال کیا گیا۔ مگر جوں جوں جنگ طول پکڑتی گئی طرفین کی طرف سے نئی نئی توپیں میدان میں آتی رہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم توپ وہ ہے جس سے اتحادیوں پر راکٹ (Rocket) قسم کے گولے برسائے گئے۔ ان توپوں کی دوسری بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان سے گولے نہایت تیز رفتاری سے چلائے جا سکتے تھے اور یہ بہت دور مار تھیں۔ اسی جنگ میں ان توپوں کے ساتھ فریقین نے ہوائی جہازوں کو بھی توپخانے کے بجائے استعمال کیا۔ مثلاً سنہ ۱۹۴۰ء کے آغاز میں جرمن فوج نے اسٹوکا ہوائی جہازوں سے دشمن پر بمباری کی اور ہوائی جہازوں کی توپوں سے گولے برسائے۔ اس کے جواب میں اتحادیوں نے اپنے ہوائی جہازوں پر تیز رفتار توپیں نصب کر کے جرمن فوج اور دوسرے نشانوں پر آگ برسائی۔ جرمنی نے اس کا جواب دی ۲ (V 2) اور ایسے ہوائی جہازوں سے دیا جو بغیر ہوابازوں کے ریڈیو کی مدد سے خودبخود چلتے تھے۔ امریکہ نے ہوائی جہاز سے ایٹم بم گرایا۔ پھر حال میں اس نے ایک نیا ہوائی جہاز تیار کیا ہے۔ جسے کوریائی جنگ میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کا نام شوٹنگ اسٹار ہے۔ یہ لڑاکا ہوائی جہاز ہے۔ جس سے بیک وقت آٹھ جٹ گولے چلائے جا سکتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۹ء کی دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں توپ خانوں کی ترتیب میں جو تغیر ہوا وہ یہ تھا کہ ہاتھیوں یا گھوڑوں سے کھینچنے کی بجائے انھیں موٹر لاریوں کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جانے لگا۔ مگر جوں جوں جنگ کی نئی نئی ضرورتیں پیدا ہوتی گئیں۔ یہ بات محسوس ہوتی گئی کہ توپوں کے لئے ایسی سواری ہونی چاہیئے جو دشوار سے دشوار گذار زمین پر خواہ پہاڑ ہوں یا دریا، ریگستان ہو یا دلدل، سے بآسانی گذر سکے۔ اس کے لئے توپ خانوں کو ٹینکوں پر نصب کیا گیا۔ اس کے بعد توپیں نہ صرف موٹر سوار فوج یا ٹینکوں کی مدد کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے لگیں۔ بلکہ توپچی بھی ان پر سوار ہو کر محفوظ طریقہ سے سفر کرنے لگے۔

کناڈا والوں نے ایسا ٹینک تیار کیا جس پر ۲۵ پونڈ والی توپ نصب کی گئی۔ اس کا نام سیکسٹن (Sexton) ٹینک رکھا گیا۔ یہ ٹینک اچھی زمین پر تقریباً ۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتا تھا اور ایک دفعہ پٹرول لے کر ۱۴۰ میل کا سفر طے کر سکتا تھا۔ مگر اس توپ کو بھی جدید توپ کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی۔

اب تک صرف ان توپوں کا ذکر کیا گیا ہے جو پیدل فوج کے ساتھ رہتی ہیں اور اس کی مدد کے لئے کام میں لائی جاتی ہیں۔ اسی لئے ان کو فیلڈ گن یا میدانی توپیں کہتے ہیں۔ چونکہ انھیں پہاڑوں کی بلندیوں پر نہیں چڑھایا جا سکتا لہذا اس کام کے لئے ہلکی توپیں استعمال کی جاتی ہیں اور ان کے نقل و حمل کے لئے خچر استعمال کئے جاتے ہیں۔ جو انھیں پہاڑوں کی چوٹی تک لے جاتے ہیں۔ ان توپوں کو پہاڑی توپخانہ (Mountain Artillery) کہتے ہیں

میدانی (فیلڈ) اور پہاڑی (ماؤنٹین) توپ خانہ کے علاوہ ایک درمیانی توپخانہ (Medium Artillery) بھی ہوتا ہے۔ اس کی توپ کا دہانہ چونکہ بڑا ہوتا ہے اور اس گولے کی مار بھی دور تک ہوتی ہے یہ 5.5" B.L قسم کی توپ ہے۔ اس سے ۱۰۰ پونڈ وزن کا گولہ ۲۰۰ ر ۱۶ گز تک پھینکا جا سکتا ہے اور ۸۰ پونڈ کا گولہ ۰۰۰ ر ۱۸ گز تک مار کر سکتا ہے۔ اس سے ہوئٹزر قسم کا گولہ بھی چلایا جا سکتا ہے اس توپ کا وزن ۵ $\frac{3}{4}$ ٹن ہے۔ اسے دشمن کے مضبوط مورچوں کو توڑنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

برطانیہ کی بھاری توپ ایل بی ۷.۲ (7.2"B.L) کا گولہ جو دوسری عالمی

جنگ کے آخری ایام میں بنائی گئی تھی ۲۰۰ پونڈ وزنی ہے اور اس کی مار ۱۹۸۰۰ گز تک ہے۔ اس کے علاوہ جرمنی کی بھاری توپ کے جواب میں (Superheavy) بہت زیادہ بھاری توپ ایجاد ہوئی اس سے ساحل برطانیہ سے فرانس میں جرمنی کے مورچوں پر گولہ باری کی جاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اس کی مار تیس میل سے زیادہ تھی۔ اس کی ٹینک شکن توپ (Anti Tank Gun) ۱۷ پونڈ کا گولہ چلاتی تھی۔ اسے ٹینک پر نصب کیا گیا۔ تاکہ ہر جگہ لے جائی جا سکے۔

جنگ کے خاتمہ کے قریب راکٹ (Rocket) قسم کی توپیں بنائی گئیں۔ اس توپ کی نالیوں کی تعداد سولہ ۱۶ ہے۔ اس کے گولوں کو بجلی کے سوئچ (Switch) سے چلایا جاتا ہے اور ہر گولہ کے پیندے میں راکٹ کے موٹر کو بجلی متحرک کرتی ہے۔ یہ سوئچ راکٹ کے بیس گولوں کو نصف سیکنڈ کے وقفہ سے ایک دم چلا سکتا ہے یا حسب ضرورت چند گولے یکے بعد دیگرے اسی سوئچ سے چلائے جا سکتے ہیں۔ راکٹ کے گولے کا وزن ۲۹ پونڈ ہوتا ہے اور اس کو ۹۰۰ر۲ گز سے ۸۰۰۰ گز تک کے فاصلہ تک چلایا جا سکتا ہے

جرمنی نے V^1 اور V^2 قسم کے گولے تیار کئے۔ دراصل یہ ایسا ہوائی جہاز تھا۔ جسے ریڈیو کے ذریعہ ہوا باز کے بغیر اڑایا جاتا تھا V^1 ہوائی جہاز نہایت سادہ اور ان گھڑ طریقے سے بنایا گیا تھا۔ مثلاً اس کے (Fuselage) یعنی بڑے حصے کے کئی حصے کر کے بولٹوں (Bolts) سے جوڑا گیا تھا اور انجن جٹ کے اصول پر چلایا جاتا تھا۔ اس ہوائی جہاز کی ساخت ایسی تھی کہ پرواز کرتے وقت اس کے (Shutters) کھلتے اور بند ہوتے رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے اس میں بہت خوفناک آوازیں نکلتی تھیں۔ یہ پیٹرول سے چلتا تھا۔ وزن قریب قریب ایک ٹن تھا اور ایک وقت میں ۱۳۵ گیلن پیٹرول بھرا جاتا تھا۔

وی ۲ (V^2) راکٹ کے اصول سے کام لیا گیا تھا۔ اس کی رفتار تقریباً ۳ ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔ اسے برباد کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ غباروں کا جال تھا کہ پرواز کرتا ہوا غباروں کے تاروں سے ٹکرا کر پھٹ جائے۔ چنانچہ یہ طریقہ بہت کارگر ثابت ہوا۔ V^2 کی شکل بڑے سگار کی سی تھی اور وزن تقریباً ایک ٹن تھا۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ توپ خانہ ان کاموں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۔ دشمن پر بہت فاصلے سے گولہ باری کی جا سکتی ہے
۲۔ توپ خانہ کی گولہ باری کو آسانی سے ایک نشانہ سے ہٹا کر تھوڑے سے وقفہ میں دوسرے نشانہ پر منتقل کیا جا سکتا ہے
۳۔ گولہ باری آناً فاناً بند کی جا سکتی ہے اور بہت کم وقت میں ان توپوں کو دوسری جگہ لے جا کر دشمن پر غارتگری کی جا سکتی ہے۔
۴۔ اسے ٹینکوں کو توڑنے، قلعوں کو برباد کرنے، ہوائی جہازوں پر گولہ باری کرنے کے لئے جب اور جہاں چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔

توپ خانہ کی قسمیں یہ ہیں:۔

۱۔ سپر ہیوی (Super Heavy)
۲۔ میڈیم ہیوی (Medium Heavy)
۳۔ ہیوی اینٹی ایر کرافٹ (Heavy Anti Aircraft)
۴۔ فیلڈ ہیوی آرٹیلری (Field Heavy Artillery)
۵۔ فیلڈ میڈیم آرٹیلری (Field Medium Artillery)
۶۔ ماؤنٹین آرٹیلری (Mountain Artillery)
۷۔ فیلڈ سپر ہیوی (Field uper Heavy)
۸۔ اینٹی ایئر کرافٹ (Anti Aircraft)
۹۔ اینٹی ٹینک (Anti Tank)

ان میں حسب ذیل قسم کے گولے چلائے جاتے ہیں:۔

۱ (H.E) یہ گولے ٹینکوں کے خلاف استعمال نہیں کئے جاتے۔ انہیں ہر قسم کی توپ میں چلایا جا سکتا ہے۔ ان سے انسانی جانوں کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔
۲-(Smoke) دھوئیں والے گولے۔ یہ بھی ہر قسم کی توپ میں چلائے جاتے ہیں۔
۳ (Gas) گیس کے گولے۔ یہ بھی ہر قسم کی توپ میں چلائے جا سکتے ہیں۔
(Anti Tank, Field, Anti Aircraft) توپوں سے بوقت ضرورت (Armour Piercing) یعنی زرہ شکن گولے چلائے جا سکتے ہیں۔

ہوائی جہازوں کی غارتگری:۔

ابھی تک ہم نے ہوائی جہازوں کے خلاف توپ خانہ کی غارتگری کا ذکر نہیں کیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی گولہ باری زمین یا سطح سمندر کی گولہ باری سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ سطح زمین یا سطح سمندر کی گولہ باری کی مثال اس شکاری کی نشانہ بازی کی سی ہے جو اپنی جگہ سے شکار پر فائر کرتا ہے۔ اس میں درمیانی، بھاری، بہت بھاری قسم کی توپیں استعمال کی جاتی ہیں۔ فیلڈ گن کے توپچی کی حیثیت بالکل اس شکاری کی طرح ہوتی ہے جو شیر یا کسی درندہ کا شکار کرتا ہے۔ ایسی صورت میں نشانہ آسان ہوتا ہے۔ مگر خطرہ کی وجہ سے شکاری کا نشانہ بسا اوقات غلط ہو جاتا ہے مگر ہوائی جہاز کے خلاف گولہ باری مرغابیوں یا اڑتے ہوئے تیتروں کی طرح ہے۔ جو سر پر سے گذر رہے ہوں۔ فرق صرف پرواز کی رفتار کا ہے۔ ہوائی جہازوں کی رفتار چھ سو میل فی گھنٹہ ہوتی ہے اور بلندی عموماً تیس، پینتیس، پچاس ہزار فیٹ۔ لہذا اس کا نشانہ بنانا مشکل ہے۔ پھر اس میں خود اپنے نشانہ بن جانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ہوائی جہاز بھی اوپر سے غارتگری کرنے کی تاک میں رہتا ہے۔

پہلی عالمی جنگ میں جب برطانیہ کو معلوم ہوا کہ جرمنی کے ہوائی جہاز لندن پر پرواز کرنے والے ہیں تو اس نے وزارت خارجیہ کی چھت پر بحری جہازوں کی دو پونڈ والے گولوں کی توپیں نصب کیں۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ توپ سے ہوائی جہاز کے شکار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ورنہ اس جنگ کے پہلے تین سال میں دشمن ہوائی جہازوں کو گرانے کے لئے مشین گنوں اور رائفلوں سے کام لینے کے منصوبے بنائے گئے تھے اور انہی پر عمل کیا جاتا تھا۔ البتہ ۱۹۱۷ء کے موسم سرما میں تین انچ دہانہ کی ایک نئی توپ ایجاد کی گئی تھی جو اختتام جنگ تک نہایت مفید و کار آمد سمجھی گئی۔

۱۹۱۸ء کے صلحنامہ کے فوراً بعد جس طرح ہوائی جہازوں کی ساخت میں ترقی ہوئی اسی طرح انہیں زمینی گولہ باری سے مار گرانے کے لئے نئی نئی توپیں بھی بنائی گئیں۔ مگر ان کی ایجاد اطمینان بخش نہ تھی۔

جب یہ محسوس ہوا کہ ہوائی جہاز تین انچ دہانہ کی توپ کی زد سے باہر ہیں۔ تو اس میں کچھ تبدیلیاں کر کے سولہ پونڈ کا گولہ چلایا گیا۔ اس گولے کی مار ۲۱ ہزار فٹ کے قریب تھی اور یہ توپ ایک منٹ میں ۲۵ - ۳۰ گولے چلا سکتی تھی۔ مگر یہ بلندی اور رفتار بھی ناکافی ثابت ہوئی تو پہلے ۳.۷ انچ کے دہانے سے کام لیا گیا۔ اگرچہ اس توپ کی مار کی بلندی زیادہ تھی۔ مگر یہ بھی اطمینان بخش نہ سمجھی گئی۔ اس لئے

پہلے ۵ء۴ انچ کی توپ بنائی گئی۔ اس کے بعد ۵ انچ دہانہ کی۔ جس کی بلندی کی مار تقریباً ۳۹ ہزار فٹ تھی۔ یہ توپ عرصہ تک برطانیہ کی طیارہ شکن (Anti Aircraft) توپ رہی۔

ابھی ہم نے ہوائی جہاز کی اس پرواز اور اس کے خلاف کارروائی کا ذکر کیا ہے۔ جسے مرغابی کی اڑان اور اس کے شکار سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ اس کی پرواز آتے اور جاتے وقت دور سے ہماری نظروں میں رہتی ہے۔ مگر تیتر کا شکار بہت کچھ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ ایک جھاڑی میں سے دفعتہً اڑ کر دوسری جھاڑی کی آڑ میں غائب ہو جاتا ہے پھر چونکہ اڑان کے وقت تیز رفتار ہونے کے ساتھ بندوق سے بہت قریب بھی ہوتا ہے اس لئے اس کو نشانہ بنانا مشکل ہوتا ہے۔ اسے گولی سے نہیں مارتے۔ بلکہ چھرّے کا کارتوس استعمال کرتے ہیں۔ ہوائی جہاز بھی ایک آڑ کی مدد سے جب دوسری آڑ میں غائب ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو اسے پھلانگ والی یعنی (Hedge (Hopping) اڑان کہتے ہیں۔ پھر بعض اوقات ہوائی جہاز دشمن کی فوج یا کسی اہم نشانہ پر غوطہ لگا کر اور اس کے قریب آکر بم گراتے یا توپ اور مشین گن سے حملہ کرتے ہیں۔ غوطہ خور ہوائی جہاز یا پھلانگ والی پرواز کے ہوائی جہاز کے خلاف بھی کارروائی کے لئے گولی دار کارتوس کے بجائے ایسی توپوں سے فائر کیا جاتا ہے جن سے ان پر گولیوں کی بارش ہو جاتی ہے۔ ابتداء میں اس قسم کا حملہ مشین گنوں یا برین گنوں سے کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دو پونڈ کی تیارہ شکن توپ بوفرز (Bofors) ایجاد ہوئی۔ آج کل حملہ آور ہوائی جہازوں پر گولیوں کی اس طرح مسلسل بوچھاڑ ہوتی ہے جس طرح آگ بجھانے والے انجن کے ہوز پائپ (Hose Pipe) سے پانی کی دھار نکلتی ہے۔ اس طرح حملہ آور طیاروں کو نشانہ بنانا آسان ہو گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نشانہ بننے کے لحاظ سے سب سے زیادہ خطرناک وہ حصہ ہوتا ہے۔ جہاں ہوا باز بیٹھتا ہے۔ یا وہ حصہ جس کی مدد سے وہ طیارہ کو اڑاتا ہے یعنی کنٹرول وغیرہ یا پھر انجن اور یہ نشانہ بہت ہی چھوٹا یعنی چند مربع فٹ کا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر اس کے کسی دوسرے حصہ میں گولیاں لگیں تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ میدان جنگ میں ہمارا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں گو ہم دشمن کے ہوائی جہاز کو فوراً گرتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ لیکن کچھ عرصہ
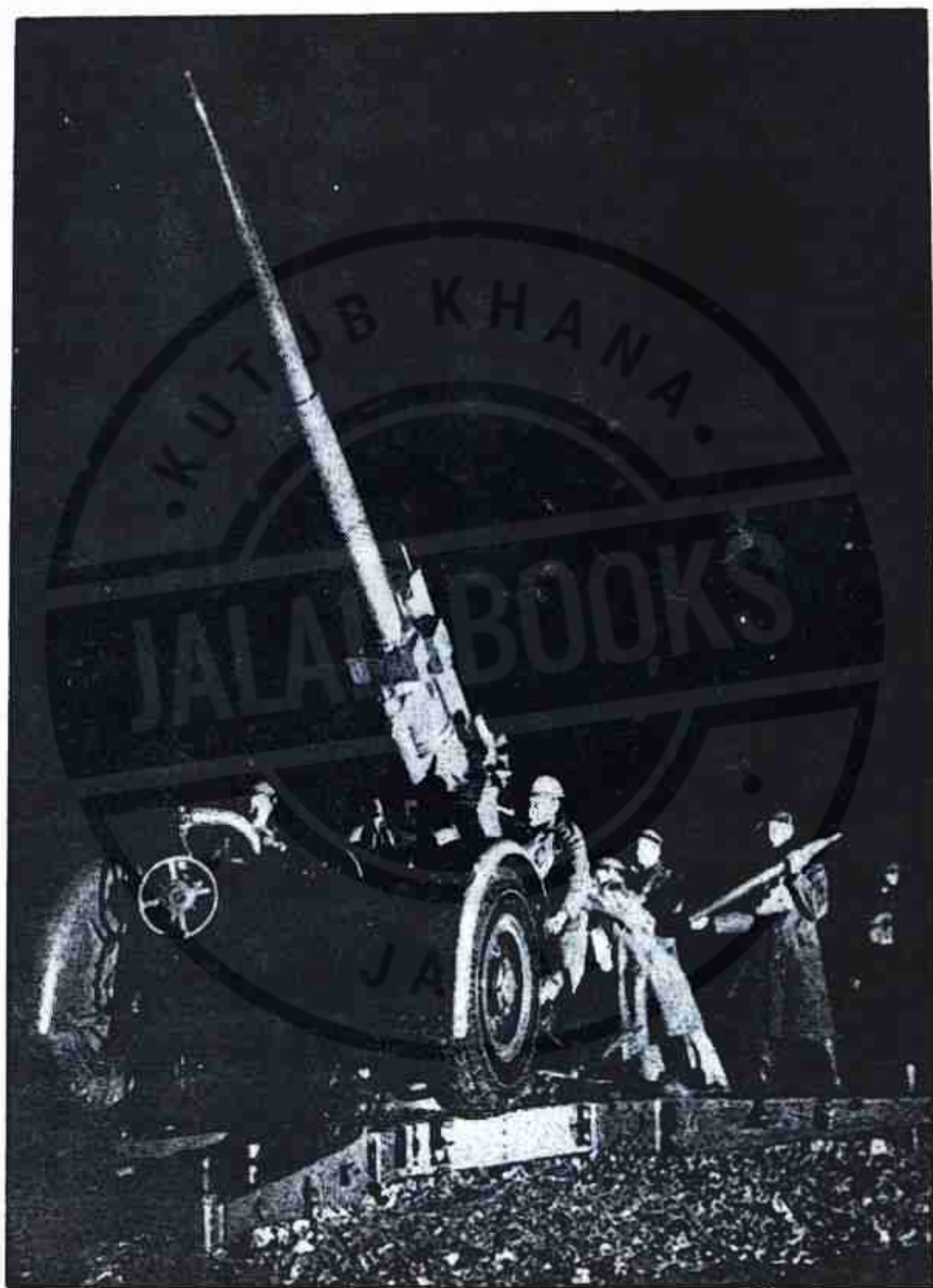
Anti Air Craft. طیارہ شکن توپ

کے لئے اس کی مخالفانہ کارروائی ختم ہو جاتی ہے۔ ہوا باز کا حوصلہ بجا نہیں رہتا اور بلندی پر پرواز کرنے کی وجہ سے حالات کا صحیح اندازہ کر کے اطمینان سے نشانہ پر بم نہیں گرا سکتا

شکاری جب کسی پرندکو اس کی جگہ سے اڑاتا ہے تو کبھی وہ تھوڑی پرواز کر کے فوراً رستہ بدل دیتا ہے کبھی دیر کی پرواز کے بعد بدلتا ہے۔ کبھی اوپر اڑنے لگتا ہے۔ اور کبھی دفعتہً نیچے کسی آڑ کی طرف غوطہ لگاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کو نشانہ بنانا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ طیارے کا ہوا باز بھی دشمن کی گولہ باری سے بچنے کے لئے اسی قسم کی حرکتیں کرتا ہے اور اس وقت اس پر نشانہ لگانا دشوار ہوتا ہے۔ مگر اب کچھ جدید آلات ایسے ایجاد ہو گئے ہیں۔ جن سے یہ دشواری کسی حد تک دور ہو گئی ہے۔ امریکہ کے ایک سائنسدان نے راڈر (Radar) ایجاد کیا ہے اور اسی کے اصول ساخت پر راڈر گن لیئر (Radar Gun Layer) بنایا گیا ہے جو توپ کو صحیح نشانہ پر خود بخود لگا دیتا ہے۔ مگر آج کل دشمن طیارے رات کے وقت پرواز کر کے غارتگری کرتے ہیں۔ اس کا مقابلہ ایک طرف تو توپوں کی گولہ باری سے کیا جاتا ہے دوسرے لڑاکا ہوائی جہازوں کی مدد کے لئے سرچ لائٹ سے روشنی پھینکی جاتی ہے۔ تاکہ وہ دشمن طیاروں کے حملہ اور پرواز کا رُخ معلوم کر سکیں اس سے دشمن کے طیارے تمام وقت نظروں سے غائب نہیں رہتے۔ پھر اب نئے نئے آلات اس تیز رفتاری کے ساتھ ایجاد ہو رہے ہیں کہ خیال ہے کہ سرچ لائٹ کی روشنی کی ضرورت بھی باقی نہ رہیگی اس قسم کی توپیں اب بھی موجود ہیں۔ جن سے ایسے گولے چلائے جاتے ہیں کہ آسمان پر کافی عرصہ کے لئے روشنی ہو جاتی ہے۔ یہ گولے اسٹار شیل (Star Shell) کہلاتے ہیں۔

حال ہی میں امریکہ نے ایسا گولہ ایجاد کیا ہے جو دشمن کے طیارہ پر ایسا جال پھینکتا ہے۔ جیسا ماہی گیر پانی میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے پھینکتے ہیں۔ اس کا نام پیراشوٹ شیل (Parachute Shell) ہے۔ یہ ۴۵ ہزار فٹ کی بلندی پر جا کر ہوائی جہاز کو پھانس لیتا ہے۔ اس کی شکل بہت بڑے کارتوس کی سی ہے۔ جب اسے چلایا جاتا ہے تو نشانہ کی بلندی پر پہنچ کر اس کا خول اوپر سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور گولہ پھٹ جاتا ہے۔ اس کے پھٹتے ہی ایک چھتری نکل کر کھل جاتی ہے۔ جس میں کئی

سو فٹ لمبا فولادی تار ہوتا ہے۔ ایک ساتھ کئی گولے چلانے سے فضا میں کئی پھتریاں یا جال اڑنے لگتے ہیں۔ اور ان کے تار ہوائی جہاز کے راستے میں مزاحم ہو جاتے ہیں۔ مبصرین کی رائے ہے کہ اگر اس قسم کے گولے کافی تعداد میں پھینکے جائیں اور دشمن کے طیاروں کے گرد فولادی تاروں کا جال پھیلا دیا جائے تو ان کا اپنے نشانہ پر پہنچنا ناممکن ہو جائے گا۔ فی الحال اس قسم کے گولوں کے استعمال میں ایک خامی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا پھیلایا ہوا جال اپنے ہوائی جہازوں کی پروازیں بھی مسدود ہو سکتا ہے

تازہ ایجادوں میں توپ کا ایک نیا گولہ ہے۔ جب اسے چلایا جاتا ہے تو اس میں لگا ہوا خود بخود چلنے والا ریڈیو فیوز جسے (Proximity Fuse) بھی کہتے ہیں۔ کام کرنے لگتا ہے اور جب راڈر کی مدد سے یہ نشانہ کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ تو پھٹ جاتا ہے۔ اس طرح گویا یہ گولہ اپنے نشانہ پر پہنچ کر اسے نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کی ساخت اس طرح رکھی گئی ہے کہ اس میں ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر اور ایک ہوتا ہے جب اسے چلایا جاتا ہے تو ٹرانسمیٹر ریڈیو کی لہریں ہر طرف پھینکتا ہے ادھر نشانہ سے جو لہریں آتی ہیں۔ انھیں ریسیور وصول کرتا ہے۔ اس طرح نشانہ جب ایک خاص مقررہ فاصلے پر رہ جاتا ہے تو اس ریڈیو کی مدد سے پراکسیمٹی فیوز (Proximity Fuse) جل جاتا ہے اور گولہ پھٹ جاتا ہے۔ اس گولہ کی مدد سے جرمنی کے V2 بم بڑی تعداد میں ضائع کئے گئے

طیارہ شکنی کے سلسلے میں ایک بڑا مسئلہ اس وقت پیش آتا ہے۔ جب ہوائی حملہ سے بچاؤ کی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جب ہم ڈنکرک سے انگلستان پہنچے، تو دشمن کے ہوائی جہاز کے آنے پر جب کبھی ہوٹر بجتا تو سب لوگ پناہ گاہوں میں چلے جاتے اس طرح دن رات بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ سڑکیں بند ہو جاتیں اور کوئی کاروبار اس وقت تک

نہ ہوتا ۔ جب تک صفائی کا ہوٹر نہ بجتا۔ اس قسم کے حملوں کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ دشمن کی جنگی تیاریوں میں خلل واقع ہو۔ یہ خلل یا نقصان بمباری یا گولے پھینکنے ہی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ کاروبار کے تعطل اور لوگوں کے ہراس سے بھی ہوتا ہے۔ جب کاروبار معطل ہو جائے۔ لوگ گھنٹوں پناہ گاہوں میں بیٹھے رہیں۔ کارخانے سامان جنگ بنانا بند کر دیں، ریلیں نقل وحمل کا کام نہ کر سکیں۔ ریلوے اسٹیشنوں اور بندرگاہوں سے آمدورفت کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو اس کا نقصان چند لوگوں کے نشانہ بن لگنے کے نقصان سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے طے یہ کیا گیا کہ بچوں اور بوڑھوں کو حفاظت کی جگہ بھیج دیا جائے۔ مگر کارخانے اس وقت تک کام کرتے رہیں۔ جب تک نگہبان خبر نہ دیں کہ اب خطرہ قریب ہے اور بچاؤ کے لئے پناہ لینا ضروری ہے۔ جوں ہی خطرہ کا وقت گذر جاتا۔ لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے۔ اس طریقہ سے کام کاج میں بہت کم ہرج واقع ہوا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ بچاؤ اور جنگی تیاریوں کو جاری رکھنے کا مسئلہ بہت احتیاط اور غور وخوض کا متقاضی ہے۔ اے۔ آر۔ پی (A.R.P) یعنی ہوائی حملے سے بچاؤ کے قوانین ایسے ہونے چاہئیں جو عام فہم بھی ہوں اور جامع ومانع بھی۔ دشمن ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ ہماری جنگی تیاریوں کو معطل کر دے اور ہماری خواہش یہ ہوتی ہے۔ کہ ہمارے باشندے امن وحفاظت سے بھی رہیں اور جنگی تیاریوں کا کام بھی مستعدی کے ساتھ جاری رہے۔ ممکن ہے اس میں کچھ جانی نقصان ہو۔ مگر یہ اس نقصان سے بہت کم ہوگا جو ہماری فوجوں کو میدان جنگ میں سامان جنگ نہ پہنچنے سے ہو سکتا ہے۔ اگر خطرہ کی ہر علامت پر کام بند ہو جائے تو یقیناً دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔

دوسری عالمی جنگ میں بلیک آؤٹ کی وجہ سے لندن جیسے شہر میں بھی بہت حادثے ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بلیک اوٹ بہت سخت قسم کا تھا اور بہت بڑے پیمانہ پر ہوتا تھا۔ حادثوں کے علاوہ سامان رسد اور سامان حرب کے نقل وحمل میں بڑی دشواری پیش آئی۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ بلیک آؤٹ ضروری نہیں ہے۔ عوام کو خطرہ سے بچانا بلاشبہ ضروری ہے۔ مگر اس سے جنگ کی تیاریوں میں کم سے کم رکاوٹ ہونی چاہیئے۔

عام طور پہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں خطرہ کا امکان کم ہوتا ہے۔ وہاں اے۔آر۔پی کے انتظامات بہت ہوتے ہیں۔انتظامات کی عمدگی و بہتری یقیناً ضروری ہے لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ جنگی ضرورت کا سامان کم سے کم استعمال ہو۔مثلاً ریت کی بوریوں سے کم سے کم کام لیا جائے تاکہ اپنی فوج کے پاس میدان جنگ میں یہ کافی تعداد میں موجود رہیں۔ اگر سب لوگ بچاؤ کے لئے پناہ گاہوں میں چلے جائیں گے تو ضروری کام کون کرے گا؟ اگر دشمن آتشیں گولوں سے مکانات میں آگ لگاتا ہے تو اسے کون بجھائے گا؟ اے آر پی کے وارڈن ہر جگہ یہ کام نہیں کر سکتے۔ جس وقت دشمن بڑے پیمانہ پر حملہ کرتا ہے تو اس وقت خطرات کو نظرانداز کر کے ہر شخص کو تندہی کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔

برطانیہ کے شہروں میں ۱۹۳۹ء کے دسمبر میں جبکہ ہٹلر نے بمباری بھی شروع نہیں کی تھی۔اے۔آر۔پی کے احکام بڑے سخت تھے۔ستمبر ۱۹۴۰ء کے سخت ترین حملوں کے بعد ہر شخص پر واضح ہو گیا کہ خطرات کو برداشت کر کے کاروبار جاری رکھنا چاہیئے اور حفاظت کے لئے پناہ گاہوں میں صرف اس وقت جانا چاہیئے۔جبکہ اس کے بغیر چارہ نہ رہے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب ہم ڈنکرک سے آنے کے بعد مڈلینڈ کے شہر آشبرن (Ashburn) کے قریب ایک جنگل میں مقیم ہوئے تو ایک دن نومبر کے مہینے میں دشمن کے ہوائی جہاز شام کے وقت سے ایک ایک کر کے آنے اور اس علاقہ پہ چکّر لگانے لگے۔ مروجہ احکام کے مطابق ہم سب سر شام ہی پناہ گاہوں میں چلے جاتے۔ پناہ گاہوں میں پانی بھرا ہوا تھا چونکہ ہم اس سرد پانی میں رات بھر کھڑے رہتے۔ لہذا کتنے ہی آدمی بیمار ہو گئے۔اس کے بعد ہم صرف اس وقت پناہ گاہوں میں جاتے۔جب خطرہ بالکل قریب ہوتا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بچاؤ کے لئے پناہ گاہوں میں مسلسل بیٹھے رہنے سے اخلاقی انحطاط اور پست ہمتی پیدا ہوتی ہے۔ برطانیہ میں جوں جوں وقت گذرتا گیا اور عوام دشمن کے حملوں سے آشنا ہوتے گئے ہر شخص کی سمجھ میں یہ بات آتی گئی کہ ہوائی حملوں میں کسی کا مارا جانا یا نقصان اٹھانا ایسا ہی ہے۔ جیسے امن کے زمانہ میں دوران سفر میں کسی حادثہ سے مر جانا یا نقصان اٹھانا۔

اسی طرح کسی دشمن طیارہ کے نظر آنے یا اس کے آنے کی خبر پر توپ سے گولہ اندازی کرنا بالکل ضروری نہیں۔ بلکہ بے جا اور بے کار ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ حفاظت کے لئے دشمن کے طیاروں پر توپوں سے گولہ باری زیادہ ضروری ہے۔ یا غباروں وغیرہ سے کام لینا۔ لیکن نہ تو بلاوجہ دشمن کے ہوائی جہازوں پر حملہ کرتے وقت گولہ بارود کا صرف درست ہے، نہ غباروں اور نہ غباروں کی چھتریوں سے دشمن کی بمباری سے پوری طرح تحفظ ہو سکتا ہے۔ پہلا طریقہ حملہ آوری کا ہے، دوسرا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بچاؤ کرنے کا۔ مناسب یہ ہے کہ حسب ضرورت دونوں پر عمل کیا جائے۔ اگر اہل لندن ابتداء ہی میں ہوائی حملوں کے خطرات کا مقابلہ اس دلیری و بے باکی سے کرتے جیسا کہ چند ماہ بعد کیا تو شہر بہت بڑے نقصان سے محفوظ رہتا۔

اس جنگ میں ہم نے کلکتہ پر جاپانیوں کی بمباری بھی دیکھی۔ یہ بہت ہی قلیل پیمانہ پر تھی۔ مگر اسے دیکھ کر شرم سے سر جھکا لینا پڑا۔ چند بموں کے گرتے ہی سارا شہر خالی ہو گیا۔ جملہ کاروبار بند ہو گئے۔ عوام کو انتہائی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ دشمن ہمیں اخلاقی شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل برطانیہ نے جنگ میں بڑے تحمل کا ثبوت دیا۔ اور اس کے خطرات کا نہایت بردباری و سکون سے مقابلہ کیا۔ ان کی مثال اور تجربات سے ہمیں فایدہ اٹھانا چاہیئے اور ایسے انتظامات کرنے اور منصوبے بنانے چاہئیں۔ جن میں مستقل مزاجی و میانہ روی سے کام لے کر اور حملہ کے اصولوں کو بروئے کار لا کر دشمن کے منصوبوں کو خاک میں ملایا جا سکے۔ ہماری جنگی تیاریاں روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری رہیں اور عوام کو بے جا خطرات سے بچایا جا سکے۔

امدادی فوجی دستے

سگنل کور یعنی محکمہ خبر رسانی

انسان اندھیرے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہتا ہے تو بصارت کی معذوری کی وجہ سے اس کے دل میں اس قسم کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں کسی چیز سے نہ ٹکرا جاؤں، چوٹ نہ لگ جائے۔ اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلا دیتا ہے اور بجائے آنکھوں کے ہاتھوں کے مس سے تمام خبریں اس کے دماغ کو پہنچتی رہتی ہیں اور دماغ ہاتھ پیروں کو احکام جاری کرتا رہتا ہے۔

اسی طرح جب دو فوجیں لڑنے کے لئے آگے بڑھتی ہیں تو ایک دوسری کی نقل و حرکت کے مخفی ہونے کی وجہ سے مختلف قسم کے دستے آگے روانہ کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ خفیہ نگاری کا کام کرتے ہیں۔ کچھ ٹینکوں، زرہ پوش گاڑیوں اور ہوائی جہازوں پر سوار ہوتے ہیں اور دشمن کی نقل و حرکت سے اپنے سپہ سالار کو مطلع کرتے ہیں۔ خبر رسانی کے ذرائع وائرلیس، ٹیلی فون اور تار برقی وغیرہ ہوتے ہیں۔ ان خبروں کے ملنے پر سپہ سالار جو فوج کے دماغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مختلف اعضا یعنی فوجی دستوں کے سالاروں کو ضروری احکام صادر کرتا ہے۔ آگے سے پیچھے اور پیچھے سے آگے جانے والے پیغامات و مراسلات سگنل کور کے ذریعہ پہنچتے ہیں اور اس کی مدد سے ماتحت حکام بکھری ہوئی فوج کو وقتاً فوقتاً احکام پہنچاتے ہیں۔ اس اعتبار سے دفاع کا یہ صیغہ بہت اہم ہوتا ہے اور اسی لئے سگنل کور کا افسر اعلیٰ سپہ سالار کے چیف آف اسٹاف کے حکم اور مشورے سے مختلف راستوں پر ٹیلیفون، تار برقی اور وائرلیس کے اڈے وغیرہ قائم کرتا ہے۔ آج کل اس صیغہ کے ذرائع خبر رسانی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تار برقی اور ٹیلی فون۔
۲۔ وائرلیس، ریڈیو ٹیلی فون یا ریڈیو تار برقی۔ راڈر وغیرہ۔
۳۔ آنکھ سے دکھائی دینے والے آلات۔ جیسے جھنڈی کے اشارات یا شیشہ کی چمک کے ذریعہ پیغام رسانی۔
۴۔ مراسلہ کو پیدل جوان، اسپ سوار، کبوتر، موٹر گاڑی یا ہوائی جہاز کے ذریعہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا۔ یا راکٹ کو استعمال کرنا۔
۵۔ کسی پیامبر کی زبانی پیام پہنچانا۔
۶۔ فوجی ڈاکخانہ کے ذریعہ خبر بھیجنا۔

ان ذرائع میں سے نمبر اسے نمبر ۵ تک کی ذمہ داری سگنل کور کی ہے۔

میدان جنگ میں فوج نہ صرف کئی میل لمبے چوڑے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے بلکہ اتحادی حکومتوں کی فوجیں جو ایک ہی مقصد کے لئے لڑتی ہیں۔ کئی کئی ملکوں میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور ان میں بری بحری اور فضائی ہر قسم کی فوجیں ہوتی ہیں۔ چونکہ ان سب کا دفاعی مقصد ایک ہوتا ہے۔ لہذا ان کا یک سو و یک جہت ہونا ضروری ہے۔ ان کو سالار اعظم وقتاً فوقتاً احکام بھیجتا رہتا ہے۔ اس لئے سگنل کور کا کام نہایت اہم اور نازک ہوتا ہے اور اس میں نظم و باقاعدگی اور پابندی وقت انتہائی ضروری ہے۔

ماضی کی جنگی تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیغام رسانی کے لئے عموماً اسپ سواروں سے کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً چنگیز خاں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے قاصدوں کو گھوڑوں کی پیٹھ پر بندھوا دیتا تھا اور یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پیغام لے جاتے تھے یا اگر فاصلہ زیادہ ہوتا تو راستہ میں گھوڑوں کی ڈاک باندھ دی جاتی تھی تاکہ پیغام جلد سے جلد معینہ مقام پر پہنچ جائے۔ آنحضرت صلعم نے غزوات میں پیغام رسانی کا کام شہ سواروں سے لیا۔ آج کل ضروری پیغام رسانی ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے بھی کی جاتی ہے۔

جب مصنف نے فوجی زندگی اختیار کی تو ۱۹۱۴ء کا زمانہ تھا۔ ان دنوں سگنل کور انڈین آرمی میں علیحدہ دستہ نہ تھا۔ بلکہ اس محکمہ کے کارکن انڈین سیپر اینڈ مائنرز (سفر مینا) یعنی انجینئر کمپنی کا جزو ہوتے تھے۔ سگنل کور کے افسروں اور سپاہیوں کی ٹریننگ کا کوئی ڈپو نہ تھا۔ بلکہ پونا میں ایک اسکول تھا جس میں فوجی دستوں کے چھنٹے ہوئے جوان

ٹریننگ حاصل کرتے تھے۔ ان کے استاد چند انگریز افسر اور سارجنٹ ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ اسکول میں بطور اُستاد کام کرتے تھے۔ باقی سیپر اینڈ مائنرز (سفر مینا) کی کمپنیوں کے ساتھ تعینات ہوتے تھے۔ جنگ لڑنے کا ایک منصوبہ تیار ہونا تھا جس کے تحت سگنل کی ٹریننگ حاصل کئے ہوئے افسروں اور سپاہیوں کو چار ڈویژنوں کے ڈویژنل سگنل اور وائرلیس سیکشن میں ترتیب دیا جا سکتا تھا۔ مگر جب ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑی تو اس منصوبہ کی ضروریات کی تکمیل کے لئے کافی افسر اور سپاہی موجود نہ تھے۔ ہندوستانی جوانوں کی تعداد ۳۵۰ نفر سے زیادہ نہ تھی۔ انگریز افسر اور سارجنٹ معدودے چند تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ افسر اور جوان فوج کے لڑنے والے دستوں، انتظامی اداروں، اسٹاف اور سالاروں کو حکم احکام اور خبریں پہنچانے کا اطمینان بخش کام نہ کر سکتے تھے اور یہ انتظام صحیح نہ تھا۔

انڈین آرمی نے درحقیقت برٹش آرمی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی۔ برطانوی فوج نے سب سے پہلے ۱۸۶۶ء میں تار برقی یعنی وہ تار جو کھمبوں پر لگایا جاتا ہے اور فیلڈ کیبل یعنی وہ تار جو زمین پر، اس کے اندر یا درختوں وغیرہ پر لگا کر میدان جنگ میں پھیلایا جاتا ہے استعمال کیا۔

۱۸۷۳ء میں لفٹننٹ کچنر نے جو بعد کو فیلڈ مارشل ارل کچنر ہوا۔ ایک ٹیلیگراف ترپ کی کمانڈ کی۔ ان دنوں ایک امریکی پروفیسر کے ایجاد کردہ طریقہ پر جسے مورس (Morse Code) خبر رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ اس میں بجلی کے تار کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پیغامات بھیجے جاتے تھے۔

جنوبی افریقہ کی بوئر وار (Boer War) میں پہلے پہل کرنل کارڈیو (Cardew) کے طریقہ بزر (Buzzer) سے پیغام رسانی کی گئی۔ اس میں بجلی کی چھوٹی اور بڑی لہروں کے ذریعے مخصوص طریقہ سے بھیجا جاتا ہے۔ یہ ڈاکخانوں میں اب تک رائج ہے۔ خصوصاً فلر فون (Fuller Phone) میں تو یہ طریقہ ترقی یافتہ ملکوں تک میں استعمال کیا جاتا ہے۔

نگران ملکوں میں جہاں پہاڑیاں اور بلند مقامات ہوں اور سورج کی روشنی صاف ہو۔ وہاں شیشے کی چمک سے پیغام بھیجے جاتے تھے۔ شیشہ کے اس آلہ کو ہیلیوگراف (Helio Graph) کہتے ہیں۔ اب اسے بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔ خصوصاً

جدید قسم کی فوجوں میں۔ اسی طرح لیمپ کے سامنے پردے لگا کر ان کی چمک سے بھی رات کو پیغام رسانی کی جاتی تھی۔

۱۹۱۴-۱۸ء کی عالمی جنگ میں ڈویژنل سگنل کور کی خامیاں آشکار ہوئیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر انگلستان کے اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم جو یونیورسٹی او-ٹی-سی (Officer's Training Corps) میں سگنل کا کام سیکھ چکے تھے برطانوی فوج میں داخل ہو کر فرانس نہ پہنچ جاتے تو بڑی ابتری پھیلتی۔ ۱۹۱۸ء میں جب لڑائی ختم ہوئی تو برطانیہ کی سگنل کور میں ۲۱۱۶ افسر اور ۵۶۷۹۲ جوان تھے۔

اسی لڑائی میں سگنل کور کے سامان، آلات اور ان کے استعمال میں تبدیلیاں ہوئیں۔ مثلاً پہلے برقی تار کو کھمبوں پر باندھ کر معلق رکھا جاتا تھا۔ مگر تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ طریقہ خطرناک ہے۔ کیونکہ اس طرح دشمن فضائی فوٹو سے تار کے نشانات سے ہمارے مورچوں کا پتہ لگا لیتا ہے۔ لہذا تار کو زمین کے اندر کافی گہرا دبا کر دشمن کے نزدیک مورچوں تک لے جایا گیا۔ اس جنگ میں بجلی کے مورس لیمپ سے کافی کام لیا گیا۔ وائرلیس بھی پہلے پہل استعمال ہوا۔ مگر اس سے صرف دشمن سے دور کے علاقوں میں کام لیا گیا۔ ۱۹۱۴-۱۸ء تک وائرلیس کے ذریعہ پیغام رسانی نے کافی ترقی کر لی تھی۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد چونکہ سگنل کور کی کارگزاری کی اہمیت تمام حکام پر اچھی طرح واضح ہو چکی تھی۔ لہذا اسے مستقل قرار دے کر انجنیئروں کے سیپرز مائنرز سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو سگنل کور ڈھانچہ کی شکل میں تھی۔ لہذا اسے حالات کے مطابق تیزی سے بڑھانا پڑا۔

۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ میں وائرلیس کو بہت زیادہ استعمال کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی بجائے ایک لائن کے تار اور ٹیلیفون کی کئی کئی لائنوں سے بیک وقت کام لینے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ پھر ان کے لئے بے شمار پیغامات کو جلد سے جلد ضبط تحریر میں لانے کے لئے ٹیلی پرنٹر (Tele Printer) ایجاد ہوا۔ اس ایجاد سے مورس کے آلہ (Fuller Phone) کی اہمیت جاتی رہی اور جلد ہی اس کا استعمال وائرلیس میں بھی ترک ہو گیا۔

پھر وائرلیس میں بھی نئی نئی جدتیں ہوئیں۔ اس کی کئی کئی لہریں ایک ہی وقت میں کئی کئی پیغامات بھیجنے اور وصول کرنے لگیں۔ اس لڑائی میں ڈی۔ آر (D-R)

یعنی دستی مراسلت کے طریقہ نے بھی بہت ترقی کی اور مختلف قسم کی باربرداری مثلاً موٹر، ہوائی جہاز، پیادہ اور جانوروں کی سواری کی مدد سے اپنی مسافت طے کی۔
اگر مختصر طور پر یہ بیان کر دیا جائے کہ میدان جنگ میں سگنل کور مختلف آلات کس طرح استعمال کرتی ہے تو اس کے فرائض کے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔
فیلڈ ٹیلیفون میگنیٹو سے گھنٹی بجنے والے ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ ٹیلیفون ہر ملک کے تار اور ہر ملک کے ایکسچینج میں استعمال ہوسکتے ہیں۔ میدان جنگ کے ٹیلیفون کے ایکسچینج ٹرمینل (Terminal) دس بیس چالیس لائن کے سوئچ بورڈ ہوتے ہیں۔ سگنلر ان کے نمبروں کو ملاتا ہے۔ ان لائنوں کو ملا کر ایک سوئچ بورڈ دو سو یا اس سے زیادہ لائنوں کا بھی ہو سکتا ہے۔
لائن ٹرمینل (Line Terminal) آلہ سے ایک یا دو جوڑ تاروں پر کئی ٹیلیفون اور تار گھروں کے سرکیٹ (Circuit) یا ملاپ دیئے جا سکتے ہیں۔
میدان جنگ کے اس حصہ میں جہاں دشمن قریب تر ہوتا ہے یا گولہ باری سے تاروں کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے یا اپنے مورچوں کو مخفی رکھنا مقصود ہوتا ہے تو وہاں یو۔جی (U.G) کا تار یعنی وہ تار جسے زمین دوز کیا جا سکتا ہے۔ استعمال کیا جاتا ہے۔ آج کل تاروں پر ربڑ کے بجائے پلاسٹک انسولیشن (Plastic Insulation) کیا جاتا ہے۔ کیونکہ پلاسٹک ربڑ کے مقابلہ میں زیادہ پائدار ہوتا ہے۔
میدان جنگ میں وائرلیس کے استعمال نے بہت سی ترقیاں کی ہیں۔ مثلاً اب وائرلیس کے ایسے آلے ایجاد ہو گئے ہیں جو وزن میں بہت ہلکے ہوتے ہیں اور آدمی انہیں آسانی سے اٹھا کر لے جا سکتا ہے۔ یہ آلے پیدل فوج، جانبازہ دستوں (Commando) اور چھاتہ فوج کے کام میں آتے ہیں۔
ٹینک دستوں کے لئے ایسے آلات ایجاد ہوئے ہیں۔ جن پر پیغامات نہایت تیزی اور سرعت سے بھیجے جا سکتے ہیں۔ ان آلات سے جب کوئی پیغام بھیجا جاتا ہے تو اسے ایک خاص قسم کی مشین میں ٹائپ کیا جاتا ہے۔ یہ مشین مختلف الفاظ کے لئے کاغذ پر مختلف سوراخ بناتی ہے۔ اس کے بعد اس کاغذ کو پیغام بھیجنے والی مشین (Transmitting Head) میں داخل کر دیا جاتا ہے جو ایک سو بیس الفاظ فی منٹ کی رفتار سے وائرلیس کے ذریعہ اسے روانہ کر دیتی ہے۔ دوسری طرف جہاں اس

پیغام کو وصول کیا جاتا ہے۔ وہاں وصول کنندہ ایک دوسری مشین پر اسے اس طرح وصول کرتا ہے کہ ٹرانسمٹنگ ہیڈ کی رفتار کے مطابق آرمی ریسیور (Army Receiver) کے اندر ایک کاغذ پر ہر لفظ کی مختلف لکیریں اور نشان پڑتے رہتے ہیں اور کاغذ باہر نکلتا رہتا ہے۔ جیسے جیسے کاغذ ریسیور سے نکلتا ہے سگنلر اس کے نشانات کو مراسلے کی صورت میں کاغذ پر ٹائپ کر کے مرسل الیہ کو بھیجتا رہتا ہے۔

توپ خانہ میں زیادہ تر مراسلات واحکام عام تار برقی کے ذریعہ بھی بھیجے جاتے ہیں اور وائرلیس کے ذریعہ بھی۔ مگر توپ خانے والے مورس کے مختلف طریقوں کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں کم سے کم وقت میں دشمن پر کارگر وار کرنا پڑتا ہے۔ مورس کی ترجمانی میں ٹیلیفون سے زیادہ وقت لگتا ہے۔

جو سگنلر چھاتہ فوج کے ساتھ کام کرتے ہیں ان کے لئے چھتری کے ذریعہ ہوائی جہاز سے زمین پر اترنے کا ملکہ حاصل کرنا لازمی ہے۔ لہذا سگنل کور سپہ سالار کے ہیڈ کوارٹر سے بٹالین کے ہیڈ کوارٹر تک پیغام رسانی کا ذمہ دار ہے۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر سے دشمن سے نزدیک تر سپاہی تک خبر رسانی کا کام بٹالین کے سگنلر کرتے ہیں۔ مگر سگنل کور اور بٹالین سگنلز میں باہم گہرا ربط و تعاون ضروری ہے۔

چونکہ سگنل کور تمام مراسلات کو ہر طرف بھیجتا اور وصول کرتا ہے۔ لہذا ان کو راز رکھنا اس کی خاص ذمہ داری ہے اور اسے پورا کرنے کے لئے وہ مختلف قسم کے خفیہ الفاظ و نشانات (Code) استعمال کرتا ہے۔ مگر راز رکھنے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مراسلہ مرسل الیہ کے پاس وقت پر پہنچے۔ یہ ذمہ داری سگنل افسر کی ہے جو نہ آسان ہے اور نہ کم اہم۔ میدان جنگ میں پیغام رسانی کا ایک جال پھیلا دیا جاتا ہے اور اسی کی کارگزاری پر بیشتر سپہ سالار کی فتح یا شکست منحصر ہوتی ہے۔

انجنیئر

جیسے جیسے نئے آلات حرب تیار ہوتے گئے۔ میدان جنگ میں انجنیئروں کے مشورہ و امداد کی ضرورت بڑھتی گئی۔ کیونکہ سائنسدان جو آلات ایجاد کرتے ہیں ان کو عام سپاہی یا افسر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ فوج کے انجنیئروں کو اس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ سائنس اور انجنیئری کے فنون اور ان کی باریکیوں کو فوج کی

ضرورت اور اس کی امداد کے لئے استعمال کر سکیں۔اسی وجہ سے فوج کو خاص احکام ہیں کہ فوجی انجینیروں سے معمولی انجینیری کے کام مثلاً میدان جنگ میں مورچے وغیرہ کے کھودنے کا کام نہ لیا جائے۔ اگرچہ انجینیروں کے دستوں کو ذاتی تحفظ کے لیے لڑنا سکھایا جاتا ہے مگر ان کو پلٹن وغیرہ کے طور پر دشمن سے لڑانا سخت غلطی ہے اس لڑائی کی تربیت پلٹن کے ہر سپاہی کو دی جاتی ہے معمولی انجینیری کے کاموں میں مشورہ دینے کے لئے ہر پلٹن وغیرہ میں ایک خاص دستہ پانیئر پلاٹون ہوتا ہے جسے اس قسم کے کاموں کی خاص تعلیم دی جاتی ہے۔

میدان جنگ میں انجینیری کا کام مخصوص نوعیت کا اور دشوار ہوتا ہے۔اس لئے اسے سرانجام دینے کے لئے انجینیروں کے مختلف دستے بنائے گئے ہیں۔تاکہ اپنا اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔یہاں ہم ان میں سے چند بڑے بڑے کاموں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ فیلڈ یونٹ یعنی میدان جنگ کے دستے۔

(ل) فیلڈ اسکواڈرن اور فیلڈ پارک اسکواڈرن جو آرمڈ ڈویژن یعنی ٹینکوں کے ساتھ کام کرتے ہیں۔فیلڈ کمپنیاں اور فیلڈ پارک کمپنیاں جو عام پیدل ڈویژنوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔

کور (Corps) فیلڈ پارک کمپنی اور آرمی فیلڈ پارک کمپنی جو کور کمانڈر یا آرمی کمانڈر کے ماتحت کام کرتی ہیں۔

مذکورہ بالا انجینیر فیلڈ یونٹ ان کاموں میں استعمال کئے جاتے ہیں:۔

اوّل۔پل بنانا، مسمار کرنے کے مختلف کام، دشمن کے راستے میں مزاحمتیں کھڑی کرنا اور دشمن کی رکاوٹوں کو دور کرنا، بوبی ٹریپ (Booby Trap) دشمن کے بچھائے ہوئے خطرناک پھندوں کا ہٹانا تاکہ اپنی فوج جانی و مالی نقصان سے محفوظ رہے۔اسی طرح دشمن کے خلاف بوبی ٹریپ (Booby Trap) بچھانے میں کمپنی کی مدد کرنا دیہات اور دوسرے مقامات کی حفاظت کے لئے مورچہ بندی، عارضی یا مستقل ذرائع آمد و رفت اور پانی کی فراہمی کا انتظام جیسا کچھ بھی ممکن ہو۔ان دستوں کی ذمہ داری ہے اس کے علاوہ دشمن کی توپوں کے وہ گولے یا بم جو بغیر پھٹے ہوئے اپنی فوج کے قریب پڑے ہوں۔اُن کو بحفاظت اٹھانا بھی ان کا کام ہے۔

دوم - انجینئرو یونٹ گیس کی لڑائی میں کیمیائی جنگ کرنے والے دستوں یعنی کیمیکل وار فیئر گروپ یا کمپنی (Chemical Warfare Groups) کا بڑی حد تک ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

سوم - فیلڈ کمپنی کی ذمہ واری ہے کہ میدان جنگ میں بالخصوص توپ خانہ کے لیے ایسے نقشے تیار کرے جن کی سپہ سالار کو ضرورت ہو۔

ان فوجی دستوں کو جو عین میدان جنگ میں کام کرتے ہیں ایسے دستوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو سلسلۂ مواصلات (Line of Communication) کو قائم رکھیں یعنی غیر مصافی علاقہ سے میدان جنگ تک آمد و رفت کے راستوں کو صاف رکھیں۔ اس کام کے لئے ان کے پاس خاص قسم کی باربرداری ہوتی ہے۔ ان دستوں کی قسموں اور فرائض کی تفصیل یہ ہے:-

۱- اپنی فوج کے دستوں کے لئے مختلف قسم کے نیم مستقل بارکیں اور مکانات بنانا۔

۲- ایسے یونٹ اور چھوٹے فوجی دستے جو بجلی کے اور دوسرے ورکشاپ چلائیں تاکہ مشینوں وغیرہ کی مرمت کا کام ہو سکے۔

۳- بڑے بڑے ڈپوؤں کے نگراں دستے۔

۴- فوجی ڈاک خانے۔

۵- ایسے ماہر دستے جن کی میدان جنگ میں فوجی دستوں کو بڑے بڑے غار کھودنے یا جنگلات صاف کرنے میں مشورہ اور امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے غار کھودنے اور جنگلات کے ماہر دستے۔

۶- ریلوے ٹرین چلانے والے دستے یعنی ریلوے کمپنیاں، دریاؤں اور نہروں کے لئے انلینڈ ٹرانسپورٹ یونٹ (Inland Transport Units) ان کا کام یہ ہے کہ میدان جنگ یا اس سے ملحقہ علاقے میں نقل و حمل کے اس ذرائع کو قابلیت کے ساتھ چلائیں۔

پہلے برطانوی فن حرب کا اصول یہ تھا کہ جب دشمن پیدل پلٹن کو آگے بڑھنے سے روک دیتا یا اس پر دشمن کا فائر زبردست ہوتا تو پیدل فوج کے سپاہی اپنی جگہ مورچہ کھود کر اس میں بیٹھ جاتے اور جب بھی موقع ملتا اور ضرورت ہوتی تو اسے گہری خندقوں میں تبدیل کر لیتے۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی اسی اصول پر لڑی گئی۔ مگر اب اس میں ترمیم ہو گئی ہے۔

اب پیدل فوج کا فرض یہ ہے کہ اپنے مورچہ کو پوشیدہ رکھے تاکہ دشمن یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کا حریف ومقابل کہاں ہے۔ اس لئے آج کل کئی کئی فاضل مورچے کھودنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ان میں سے بیشتر میں کوئی فوجی دستہ نہیں ہوتا۔ گویا مورچوں کی کھدائی کا کام بہت بڑھ گیا۔ یہ مورچے تھوڑے وقت میں کھودے جاتے ہیں۔ اس لئے اہم ترین بات یہ ہے۔ کہ پیدل اور دوسری تمام فوجیں اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کے معاملے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ انگریزی میں چھپنے اور پوشیدہ رہنے کو کیموفلاج (Camouflage) کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ پوشیدہ رہنے کی ایسی ترکیبیں کی جائیں کہ نہ دشمن کی جسمانی آنکھ دیکھ سکے۔ نہ فوٹو کیمرہ کی آنکھ یعنی لینس۔ ان ترکیبوں کے اختیار کرنے میں انجینئر افسر اور دستے دوسرے فوجی دستوں کو ضروری ومفید مشورے دیتے ہیں اور پوشیدگی کے سامان کی فراہمی اور استعمال میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

۱۹۳۹-۴۵ء کی دوسری عالمی جنگ میں انجینئروں کی مدد سے مختلف مقامات پر عین لڑائی کے دوران میں بہت تھوڑے وقت کے اندر نہایت مضبوط مورچے بنائے گئے مثال کے طور پر طبروق میں، ماسکو اور اسٹالن گراڈ میں اور دنیا پر یہ ظاہر ہو چکا ہے۔ کہ ان جگہوں نے نہایت مستحکم قلعوں کا کام دیا۔ جنگ کے آخری دور میں جب فرانس پر حملہ کرنے کی تجویز ہوئی تو اتحادیوں کو معلوم تھا کہ نازیوں نے یورپ کی بندرگاہوں کو نہایت مستحکم طور پر قلعہ بند کر دیا ہے۔ مگر انجینئروں نے نئی قسم کی گودی ملبری (Mulberry) تیار کی اور اسے ساحل پر ڈال دیا جس کی مدد سے کئی لاکھ اتحادی فوج دوبارہ یورپ کی سرزمین پر اتر گئی۔

اسی طرح دریاؤں کو عبور کرنے کے لئے ٹینکوں کے ذریعے ایسے پل بنائے گئے جو کہ صرف تھوڑے وقت میں تیار ہو گئے۔ اور ان پر بھاری توپیں اور ٹینک آسانی سے گذر سکیں۔ انجینئروں نے ٹینکوں کی مدد سے ان سڑکوں اور علاقوں کو صاف کر دیا۔ جہاں دشمن نے سرنگیں (Mines) اور بوبی ٹریپ (Booby Trap) بچھا رکھے تھے۔ دریاؤں اور سمندروں کو پار کرنے کے لئے بیلی بیرج (Baily Bridge) تیار کئے۔ نیز ایسی کشتیاں جنھیں تہ کر کے اور لاری پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے لے جایا جا سکے۔

دلدلی زمینوں یا پولی اور ریتیلی زمین پر نئی ایجادوں سے ہوائی اڈے تعمیر کئے۔ برما میں فوجی انجینئر دستوں نے کئی سو میل لمبے تیل کی پائپ لائن بنائی۔ جس کی مدد سے پہاڑوں کی

چوٹیوں پر سے تیل جنگلوں اور پہاڑوں میں مہیا ہوا اور ہوائی جہازوں میں استعمال کیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مشینوں سے کام لے کر انجینئروں نے میدان جنگ میں جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیا تھا جو کام پہلے ہاتھ سے مہینوں میں ہوتے تھے یا ہو سکتے تھے وہ بجلی اور مشین کے ذریعہ منٹوں میں ہونے لگے مثلاً لاری کے ذریعہ بجلی اور آرہ کش مشین سے جنگلوں کو کاٹ کر راستے بنائے گئے۔ دلدلوں میں کٹے ہوئے درختوں کو ڈال کر اور بولڈوزروں (Bull Dozers) سے پتھر اور مٹی کو کوٹ کر عمدہ قسم کی سڑکیں تیار کی گئیں۔ ان کاموں کی وجہ سے آج کل فوجی انجنیئر فوج کا نہایت اہم جزو ہیں۔ جب ۴۵-۱۹۳۹ء کی جنگ شروع ہوئی تو انڈین آرمی میں صرف تین سیپر مائینرز یعنی انجینئر کمپنیاں تھیں۔ ایک بمبئی سیپر مائنرز۔ دوسری مدراس سیپر مائینرز اور تیسری بنگال سیپر مائنرز۔ دوران جنگ میں ان تینوں میں بہت زیادہ توسیع کی گئی۔ مگر جب لڑائی ختم ہو گئی۔ تو ان میں زبردست تخفیف کر دی گئی۔ ان کمپنیوں کا ایک تہائی پاکستان کے حصہ میں آیا۔ جسے آج کل رائل پاکستان انجینئرز کہا جاتا ہے۔

رائل پاکستان آرمی سروس کور

سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی سے پہلے ہندوستان میں کمیسریٹ (Commissariate) کا محکمہ تھا۔ جسے بعد کو سپلائی ٹرانسپورٹ کا نام دیا گیا۔ اس کے فرائض یہ تھے:-

ا۔ گورہ فوجوں کو ہمیشہ مگر ہندوستانی فوجوں کو بعض حالات میں سامان خوراک مہیا کرنا۔

ب۔ بعض حالات میں گورہ فوج کے دستوں کے جانوروں اور انڈین آرمی کے جانوروں کو دانہ گھاس وغیرہ مہیا کرنا۔

ج۔ گورہ فوج کی بارکوں کے لئے مٹی کا تیل، سبزی ترکاری اور گوشت وغیرہ فراہم کرنا۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد انڈین آرمی سروس کور وجود میں آئی جسے آگے چل کر رائل انڈین آرمی سروس کور کا نام دیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں اس کا فرض گورہ اور ہندوستانی

دونوں فوجوں کو راشن اور ٹرانسپورٹ مہیا کرنا قرار دیا گیا اور میدان جنگ میں اس کے فرائض حسب ذیل رکھے گئے۔

(ا۔ سپلائی: انسانوں اور جانوروں کے لئے سامان رسد مہیا کرنا۔ فوجی دستوں کے لئے پٹرول، مشین کا تیل، لکڑی، کوئلہ، مٹی کا تیل، ہسپتال کے لئے جملہ قسم کا سامان، پھل، سبزی، ٹین کے ڈبوں میں بند چیزیں جیسے بسکٹ اور پھل وغیرہ یہی محکمہ فراہم کرتا ہے۔

ب۔ ٹرانسپورٹ یعنی فوج کی بار برداری کی تمام ضروریات مہیا کرتا ہے۔ گولہ بارود، فوجی انجینئروں کا مختلف سامان، اسلحہ اور دوسرا سامان حرب نیز ڈاک۔ یہی محکمہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔

(ج) خاص حالات میں پیدل فوج، مریضوں اور زخمیوں کے لئے باربرداری مہیا کرتا ہے۔ اسے اپنے فرائض کبھی صحراؤں میں انجام دینا پڑتے ہیں کبھی برفانی پہاڑوں میں کبھی جنگلوں میں اور کبھی دلدلوں میں۔ باربرداری کا ذریعہ کبھی ہوائی جہاز ہوتے ہیں کبھی موٹر لاریاں، کبھی ٹینک کی قسم کے کیریر ہوتے ہیں۔ کبھی خچر، اونٹ، ہاتھی، گھوڑے اور گدھے۔

جنرل ٹرانسپورٹ کمپنیاں مفصلہ بالا اقسام باربرداری کے لئے بنائی گئی ہیں۔ نپولین کا قول ہے کہ "سپاہی میدان جنگ میں پیٹ کے بل پر لڑتا ہے" یعنی بھوکا سپاہی لڑائی نہیں لڑ سکتا۔ سقراط نے جنرل کی صفات میں سب سے پہلے اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے "کہ جنرل کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کے سپاہیوں کے پاس سامان خوراک اور سامان حرب کافی ہے اور آیندہ اسے مہیا کرنے کا انتظام مکمل ہے یا نہیں" خوراک و رسد کے بغیر سپاہی کی قوت معطل ہے۔ گولے کے بغیر توپ بیکار ہے اور پٹرول کے بغیر موٹر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتی اور یہ سب چیزیں اس محکمہ کی اہمیت کی واضح دلیل ہیں۔

پاکستان آرمی آرڈیننس کور

۱۹۱۴ء سے پہلے ہندوستان میں محکمہ ذخائر حرب اطمینان بخش نہ تھا۔ اس کے افسر اور چھوٹے عہدیدار تمامتر انگریز ہوتے تھے۔ مگر ۱۹۲۲ء کے بعد اس میں تبدیلی شروع ہوئی

اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۱۸ء میں ڈیفنس کمیٹی نے سفارش کی کہ اس محکمہ کو بھی برطانوی آرڈیننس کور کی طرح ڈھالا جائے۔ چنانچہ اب اس محکمے کے فرائض یہ ہیں۔

آلات حرب مہیا کرنا۔ ان کی نگرانی اور مرمت کرنا۔ مختلف مقامات سے اسلحہ اور گولہ بارود وصول کرنا اور تمام فوجی دستوں میں تقسیم کرنا۔

آرمی آرڈیننس کور کے دستے فوجی دستوں مثلاً ڈویژن وغیرہ کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں اور یہ دستے مختلف ذخائر اسلحہ بار برداری کے ذریعے کمانڈر کے حکم کے مطابق میدان جنگ میں جمع کرتے اور حسب ضرورت فوجی دستوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا فرض ہے کہ لڑنے والے جوانوں کے لئے کافی تعداد میں گولہ بارود موجود رہے تاکہ انہیں انتظار نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ کمانڈر کے منصوبہ کے مطابق یہ جملہ قسم کے ذخائر برابر آگے بھیجتے رہتے ہیں تاکہ لڑنے والے جوانوں کو سامان برابر ملتا رہے۔

گولہ بارود کی فراہمی اور سامان ذخائر حرب کی نگرانی کے علاوہ اس محکمہ کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ میدان جنگ میں ایسا انتظام کرے۔ جس سے سپاہیوں وغیرہ کے کپڑے دھلتے رہیں اور بیماری وغیرہ کی صورت میں ان کا علاج معالجہ ہوتا رہے۔ اگر کسی توپ میں کوئی نقص واقع ہو جاتا ہے۔ تو یہ اس کی جگہ دوسری نئی توپ بھیجتا ہے اور اپنے کارخانہ میں اس کی مرمت کراتا ہے۔ اگر آرمی سروس کور کی لاری ٹوٹ جاتی ہے۔ تو نئی لاری مہیا کرتا ہے۔ ہسپتالوں میں آلات جراحی فراہم کرتا ہے۔ اور جوانوں کے لئے وردی اور کپڑے وغیرہ سپلائی کرتا ہے۔ یہ تمام کام اس کے فرائض میں شامل ہیں ۔

ملکی سرحدات قلعہ جات اور ہتھیار

قیام پاکستان کے بعد ہر پاکستانی کی نظریں اپنے ملکی حدود پر لگی ہوئی ہیں کہیں کشمیر کا مسئلہ ہے کہیں افغانستان کا۔ پنجاب اور بنگال کی سرحدوں کے متعلق ہند و پاکستان میں کئی کانفرنسیں ہو چکی ہیں اور ابھی غالباً اور بھی ہوں گی۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ بلاشبہ یہ جھگڑے برطانیہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں مگر کیا یہ پہلی غلطی ہے جو برطانیہ نے حدود بندی کے سلسلے میں کی ہے؟ پھر یہ غلطی ہے یا دیدہ و دانستہ بنائے مخاصمت رکھی گئی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ برطانیہ نے پہلی بار ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس سے پہلے بھی کر چکی ہے۔ مثلاً جب اس نے سیستان کی حدود کے جھگڑے کا فیصلہ کیا تو افغانستان کے فرمانرواکو اس کی وجہ سے ۱۸۸۰ء میں برطانیہ سے جنگ کرنا پڑی۔ اس کے بعد ۱۸۸۴ء میں ترکستان کی حدود بندی شروع ہوئی تو روس اور برطانیہ میں ٹھن گئی اور جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اسی حدود بندی کی بنا پر امراؤ حکام دہتر چترال سے حکومت ہند کی جھڑپ ہوئی اور اسی کی وجہ سے شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے قبائل سے حکومت ہند کی مسلسل جنگ جاری رہی۔ پھر اس حدود بندی کے ذریعہ حکومت برطانیہ نے جب ہندوستان کی تقسیم کی تو ۱۹۴۷ء میں قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا۔ جس کی پیدا کی ہوئی بے چینیوں، بے اطمینانیوں اور بداعتمادیوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

جس ملک کی حدود قدرتی طور پر متعین ہوتی ہیں یعنی ملکی و جغرافیائی اعتبار سے قدرتی حدود سے محدود ہوتا ہے وہ بہت خوش قسمت ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے وہ بہت سے جھگڑوں سے محفوظ رہتا ہے اور دشمن بھی سمندر، پہاڑ یا دریاؤں کو عبور کئے بغیر حملہ نہیں کر سکتا۔ اس نقطۂ نظر سے ایشیا کے نقشہ پر نظر ڈالئے تو انڈو پاکستان روسی خطرے سے ہمالہ کے بلند و سنگین سلسلوں اور پامیر و ہندوکش کے فلک بوس پہاڑوں

کی وجہ سے بہت حد تک محفوظ نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پہاڑوں نے اسے شمال سے الگ کر کے اپنی آغوش میں لے لیا ہے اور کشمیر سے آسام تک یہ پورا خطہ محفوظ و مامون ہے۔ ان پہاڑوں کی پاسبان چوٹیوں ایورسٹ، کنچنچنگا اور دیونگری کو سر کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر بے سود ۔ بلوچستان سے افغانستان تک اور کافرستان سے درہ قراقرم تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ بڑی فوجوں کے گذر کے قابل نہیں۔ اسی وجہ سے اکثر دفاعی مبصروں نے اس طرف سے کسی بیرونی حملے کو ناممکن قرار دیا ہے۔ مگر کیا تاریخ اس خیال کو صحیح قرار دیتی ہے؟ مگر محمود غزنوی اور تیمور جیسے اولوالعزم فاتحوں کے کارنامے ہمیں کیا بتاتے ہیں۔

جس طرح قدرتی خطوط کسی ملک کے حدود قائم کرتے ہیں اسی طرح قوموں، ان کی زبانوں اور مذاہب پر بعض تاریخی واقعات بھی قدرتی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ بعض اوقات انہی اسباب کی بنا پر مملکتوں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ مثلاً قومی نظریہ کی بنا پر ۱۹۳۳ء میں جرمنی کی حکومت قائم ہوئی۔ مذہب کی بنا پر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں موجود ہیں۔

تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ترکی کی حکومت بحیرہ ایڈریاٹک سے بحیرہ اسود تک بحیرہ اسود سے دریائے سیو (Save) تک، سیو سے ڈینیوب تک، بلگریڈ سے آرسوا (Orsova) تک اور وہاں سے کارپیتھین اور دریائے پرتھ (Pruth) تک پھیلی ہوئی تھی اور یہ حدود دفاعی سیاست کے نقطۂ نظر سے بڑی مستحکم تھیں۔ کیونکہ حکومت ترکی اپنی حفاظت کے لئے دشمن کے خلاف اندرونی خطوط (Interior Lines) کے دفاعی اصول پر نہایت آسانی سے عمل کر سکتی تھی۔ مگر اسے شکست ہوئی۔ پہاڑی علاقوں کے لوگ چونکہ بالعموم جنگجو اور بہادر ہوتے ہیں۔ اس لئے قدرتی رکاوٹوں کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے قلعہ جات اور قلعہ جات کے دفاع کے لئے توپخانہ اور فوجوں کی آمد و رفت کے لئے راستے بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ **قوموں کے تحفظ کا ضامن انسان ہی ہوتا ہے**۔ قدرتی حدود اور رکاوٹیں ان کی قطعی طور پر حفاظت نہیں کر سکتیں۔ وہ پہاڑی لڑائیاں اور وہ حملے جو آریاؤں کے ورود سے ۱۹۴۷ء تک برصغیر انڈو پاکستان پر ہوئے ۔ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہیں۔

پہاڑی لڑائیوں سے ہماری مراد وہ لڑائیاں نہیں ہیں جو کسی پہاڑی درہ کی حفاظت

یا اسے فتح کرلنے کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ بلکہ مراد وہ تمام لڑائیاں ہیں جو پہاڑی علاقہ کے تحفظ یا تسخیر کے لئے لڑی جائیں۔ اس قسم کی لڑائیاں کئی کئی سو میل لمبے اور چوڑے علاقہ میں لڑی گئی ہیں۔ ایسی جنگ کا منصوبہ بناتے وقت اور لڑائی کے دوران میں بڑی دور بینی اور استقلال سے کام لینے کی ضرورت ہے اور علاقہ کے سارے نشیب و فراز سامنے رکھ کر حملہ یا دفاع کی کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح گویا عزم و نظم دونوں کا سخت امتحان ہوتا ہے۔ سپہ سالار کو ذاتی طور پر مشاہدہ اور مطالعہ میں وقت صرف کرکے جنگ کا نقشہ بنانا پڑتا ہے۔

غیر قدرتی حدود عام طور پر فرضی یا متعین کردہ ہوتی ہیں۔ جیسے راجپوتانہ سندھ اور پنجاب کے مابین ہندو پاکستان کی حدود۔ کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بعض علاقوں کے مابین بھی ایسی ہی فرضی حد بندی ہے۔ اسی طرح ریاستہائے متحدہ امریکہ اور میکسیکو کی درمیانی سرحد تھی۔ اس میں بعض جگہ گہرے نالے، بنجر علاقے یا پہاڑی خطے سرحد کا کام دیتے تھے۔ مگر ریاستہائے امریکہ کی فوجوں نے اسے پار کرکے ۱۸۴۷ء میں میکسیکو کو فتح کرلیا۔

بعض اوقات سرحد بڑی پر پیچ اور خمدار ہوتی ہے۔ جیسے شمالی پہاڑی علاقہ میں پاکستان کی سرحد۔ اگر ان پہاڑوں میں سے نکلنے والے دریا ملک میں بہتے ہیں۔ تو یہ حدود بیکار اور خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان دریاؤں کے متوازی بڑی آسانی سے عمدہ سڑکیں بنائی جاسکتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حدود ایک دوسرے ملک کے اندرونی علاقہ تک چلی جاتی ہیں۔ ان سے بھی دفاع و تحفظ کے معاملہ میں بڑی دشواری اور پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً انڈو پاکستان کا پنجاب و بہاولپور کے حدود

سیاستدانوں کی کمزوری، دور بینی یا حکمت عملی کی بنا پر اس قسم کی سرحدات پر قلعہ بندیاں کرنے کا طریقہ بہت پرانا ہے۔ اس قلعہ بندی کی ایک قدیم ترین یادگار دیوار چین ہے۔ یہ دیوار بڑی اہم ہے۔ اس کے مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غیر متحرک اور بلا مزاحمت بچاؤ کے اصول پر تعمیر کی گئی تھی اور اس کو بنانے والی حکومت نے اپنی فوجوں کی نقل و حرکت اور قوت مزاحمت کے بجائے پتھر اور مسالے کی مضبوطی کے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا۔ دیوار یقیناً مستحکم تھی۔ لیکن اس سے بنانے والوں کی دفاعی نااہلیت کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ دیوار دو ہزار میل لمبی تھی اور کئی جگہ نہایت دشوار گذار بلند پہاڑوں

پر سے گذرتی ہے ۔ یہ ایسا علاقہ ہے ۔ جہاں چند جانباز دشمن کے بڑے بڑے لشکروں کو کافی عرصہ تک روکے رکھ سکتے ہیں۔ یہاں دیوار بنانے کی ضرورت نہیں تھی ۔ مگر اس کے برعکس یہ دیوار اس علاقے میں بہت مضبوط ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ دارالحکومت سے قریب تھا۔ مگر جہاں یہ دارالحکومت سے دور ہے ۔ وہاں بھونڈی اور کمزور ہے۔ بعض جگہ یہ پچاس فٹ بلند ہے ۔ اور اوپر اتنی چوڑی ہے کہ دو رتھ برابر برابر چلائے جا سکتے ہیں۔ پتھر اور مسالہ نہایت مضبوط ہے۔ بعض جگہ اس کی بلندی صرف بیس فٹ ہے۔ کچی مٹی کی بنی ہوئی ہے اور چوڑائی بھی کم ہے پھر دیوار بنائی ہی نہیں گئی۔ یہاں لمبے لمبے خلا ہیں۔ اگرچہ دروازے بڑے بڑے اور مضبوط ہیں۔ مگر مجموعی اعتبار سے مقصد دفاع کو پورا نہیں کرتی ۔ یہی وجہ ہے ۔ کہ اس سے تاتاریوں کے حملے نہ رک سکے اور چین کی سلطنت انہی حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئی ۔

دیوار چین کی مثال اس دفاعی سیاسی اصول کی بہترین دلیل ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ جو قوم دفاعی سیاست اور فن حرب سے نابلد رہتی ہے ۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتی ۔ اس کی خوش حالی ، دولت اور تجارت اس کے لئے اور بھی وبال جان بن جاتی ہے اور اسے زندہ رہنے نہیں دیتی ۔

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرحدات پر کہیں نہ کہیں ایسے مقامات ضرور ہوتے ہیں جنہیں طے کرنے کے لئے قابل اور حوصلہ مند جرنیل کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں آسانی سے عبور کیا جا سکتا ہے سرحدات کیسی ہی دشوار گذار کیوں نہ ہوں اور کاہل حکومت نے دولت صرف کر کے کیسی ہی قلعہ بندیاں کیوں نہ کر لی ہوں۔ بہادر اور دلیر حملہ آور کو اس وقت تک نہیں روکا جا سکتا ۔ جب تک قلعہ بندیوں کی حفاظت کے لئے جرار فوج موجود نہ ہو سکندر اعظم کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ ۳۳۱ قبل مسیح میں وہ اہل فارس کو شکست دے کر میدیا پہنچا۔ اس کے بعد کوہ ہندوکش کو پار کر کے سوات کے نہایت دشوار گذار راستوں سے ہوتا ہوا اٹک اور اٹک سے جہلم پہنچ گیا۔ جہاں راجہ پورس کو شکست دی ۔

تیمور لنگ ۱۳۳۶ء میں سمرقند کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ ۱۳۷۰ء میں جب اپنی قوم کا بادشاہ بنا تو آرمینیا ، ایران ، خراسان ، کردستان ، مشرقی روس

اور پولینڈ وغیرہ کو زیرنگین کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس وقت اس کے ساتھ ۸۰ ہزار رسالہ تھا۔ وہ ہندوکش کو پار کر کے کابل اور ہرات کے راستے ہندو پاکستان کے شمالی مغربی حدود میں داخل ہوگیا۔ یہ حملہ اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ سوات اور پنج تر میں ان کافروں نے جو سکندر اعظم کی فوج کی نسل سے تھے تیمور کا سخت مقابلہ کیا اور یہ وقت تھا جبکہ پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ سردی شدت کی تھی۔ گھوڑوں کے لئے چارہ کی قلت تھی۔ موسم اور باشندوں کی مخالفت کی وجہ سے تیمور اس علاقہ کو چھ مہینے میں طے کر سکا۔ اس کے بعد وہ دریائے سندھ کے کنارے پہنچا۔ وہاں سے دہلی کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ سلطان محمد کے لشکر کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ برف پوش پہاڑ دشوار گذار راستے اور بہادر باشندوں کی مزاحمتیں اور مخالفتیں اسے نہ روک سکیں۔

اسی طرح محمود غزنوی نے دشوار گذار پہاڑی علاقوں کو طے کر کے ہندوستان پر کئی دفعہ حملے کئے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپانیوں نے آسام کے نہایت گھنے جنگلوں اور دشوار گذار علاقوں کو طے کر کے ہندوستان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ قدرتی رکاوٹیں اور دشوار گذار خطے کسی ملک کی حدود کو دشمن کے حملے سے نہیں بچا سکتے اور یہی وجہ ہے کہ حکومتیں اپنی ملکی سرحدات پر قلعے تعمیر کراتی ہیں۔ مگر سرحدات پر قلعہ جات کا بنانا اور ان کی نوعیت کا متعین کرنا ایسا مختلف فیہ مسئلہ ہے جس پر دفاعی مبصرین کبھی متفق الرائے نہیں ہو سکے۔ ایک گروہ قلعہ جات کی اہمیت فلسفیانہ نقطۂ نظر سے متعین کرتا ہے۔ دوسرا انجینیری کے نقطۂ نظر سے۔ اگرچہ انسانی فطرت اور دفاعی سیاست کے اصول دونوں ہمیشہ سے غیر مبدل چلے آتے ہیں۔ تاہم یہ کہنا کہ قلعہ بندی کہاں ہو اور کیسی ہو ایسا سوال ہے۔ جس پر ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔

فرانس کی حکومت نے اس مسئلے پر ہمیشہ غور و خوض کیا اور بیرونی حملوں سے تحفظ کے کاموں پر زرِ کثیر صرف کر کے میجنو لائن تیار کی مگر نتیجہ حسب مراد نہ نکلا۔ غیر منقسم ہندوستان میں بھی قلعہ جات کثرت سے تھے مگر نتیجہ یہاں بھی کچھ بہتر نہ ہوا۔ یہ مثالیں سرحدی قلعہ بندیوں پر صرف کثیر کے جواز کے خلاف ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنا روپیہ کا صحیح طور پر صرف نہیں کیا۔

قلعہ جات کے مخالفین کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان میں بہت بڑی فوج

غیر متحرک ہو کر معطل ہو جاتی ہے بعض مبصرین کہتے ہیں کہ جدید آلات جنگ کی ایجاد کی وجہ سے ایک قلعہ جو تعمیر کے وقت بہت اہم معلوم ہوتا ہے۔ کچھ دنوں بعد بیکار اور غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ بات بلاشبہ کسی حد تک درست ہے۔

مگر مبصرین کی رائے کی تائید یا مخالفت کئے بغیر ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ فی الحقیقت قلعہ جات کی تعمیر کا مقصد کیا ہے۔

قلعہ جات ہمیشہ سے استعمال ہوتے چلے آئے ہیں۔ یہاں تک کہ دوسری عالمی جنگ میں بھی انہیں استعمال کیا گیا۔ ہمارے نقطۂ نظر سے قلعہ جات کے مقاصد دو ہیں۔ اوّل مملکت کے کسی اہم مقام کی حفاظت کے لئے ان سے مستقر کا کام لینا، دوم حملہ آور دشمن کے حملہ کی روک تھام کے لئے مزاحمت پیدا کرنا۔

اگرچہ ہم نے ان دونوں مقصدوں کو الگ الگ بیان کیا ہے مگر حقیقتاً یہ دونوں ایک دوسرے سے متعلق اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ مثال کے طور پر اگلے زمانہ میں قلعہ بندیاں اس لئے کی جاتی تھیں کہ شہر کے باشندوں کو لٹیروں، ڈاکوؤں اور آس پاس کے حریص حکمرانوں سے امان مل سکے۔ اس زمانہ میں ہر چھوٹا بڑا حکمران اپنی جگہ مستقل بادشاہ ہوتا تھا باقاعدہ فوج بہت کم ہوتی تھی اور جنگ کے خطرہ کے وقت ہر شخص کو اپنے علاقہ کی حفاظت کے لئے ہتھیار اٹھانے پڑتے تھے۔ قلعہ بندیوں کی وجہ سے ان حکمرانوں کو اپنی اپنی بے قاعدہ فوج کو تربیت دینے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ گوالیار، احمد آباد اور چتوڑ وغیرہ کے قلعے اسی مقصد کے لئے تھے۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ حکومتوں نے اپنے مخالفوں اور بدنیت پڑوسیوں سے حفاظت کے لئے اپنی حدود پر قلعہ جات کا سلسلہ تعمیر کرنا شروع کیا۔ اہل ایران نے چنگیز خاں کے حملوں سے بچنے کے لئے اسی طرح قلعے تعمیر کئے۔ فرانس نے بھی جرمنوں کے حملے سے بچنے کے لئے اپنی شمالی مشرقی سرحد پر قلعے بنائے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے اس نے میجینو لائن تیار کر کے اپنی حفاظت کرنا چاہی۔ ہٹلر نے اوقیانوسی دیوار (Atlantic Wall) اور سیگفریڈ لائن کے ذریعہ جرمنی کو محفوظ اور ناقابل تسخیر بنانے کی کوشش کی۔ مگر آج تک کوئی قلعہ خواہ وہ کیسا ہی مضبوط کیوں نہ ہو اور اس میں کتنی ہی فوج کیوں نہ تعینات ہو۔ وہ اس حکومت اور ملک کو بچانے میں جس نے غیر متحرک دفاع کے اصول پر اپنے تحفظ کا منصوبہ بنایا۔ قطعی طور پر ناکام ثابت ہوئے۔

جب ہم ۱۹۳۹ء میں فرانس کی سرزمین پر جرمنی سے لڑنے کے لئے گئے تو ہر فرانسیسی یہ سمجھتا تھا کہ میجنولائن ناقابلِ تسخیر ہے۔ یہ دعویٰ نیا نہ تھا۔ چتوڑ کے قلعہ کو بھی ناقابلِ تسخیر کہا جاتا تھا۔ گوالیار کا قلعہ بھی ناقابلِ تسخیر مشہور تھا۔ مگر ان کا وہی حشر ہو چکا تھا جو جرمنوں کے ہاتھوں میجنولائن کا ہوا۔

۱۹۱۴ء سے بلجیم کو بھی اپنے قلعوں کی مضبوطی پر ناز تھا۔ مگر جب لڑائی چھڑی اور جرمنوں نے بلغار کی تو چند روز کے اندر یہ قلعے جرمن توپ خانہ کے ہاتھ میں آ گئے۔ البتہ ورڈن کے قلعہ نے جرمنوں کی پیش قدمی روک دی۔ اسی طرح شمالی افریقہ میں طبروق نے کئی سال تک جرمنوں اور اطالویوں کے دانت کھٹے کئے۔ بعد میں یہی طبروق بغیر کسی مزاحمت کے جرمنوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

جہاں میجنولائن جرمنی کے سیلاب کو نہ روک سکی۔ وہاں کیلے (Cailais) نے فتحمند جرمنوں کو للکارا اور کئی ہفتہ تک انھیں روک کر اتحادی فوج کو ڈنکرک سے بچ نکلنے کا موقع دیا۔

ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ ان قلعوں کی حفاظتی فوج نہ صرف عزم و حوصلہ مندی کے ساتھ لڑی۔ بلکہ اس کا اصول دفاع محض بچاؤ نہ تھا۔ بلکہ بچاؤ کے ساتھ حملے کا بھی تھا اور ان قلعوں کو چاروں طرف سے محصور نہیں کیا گیا تھا۔ پیچھے کی سمت کھلی رہی۔ جہاں سے ان کو برابر کمک اور رسد وغیرہ ملتی رہی۔ پھر بڑے بڑے دہانوں کی توپوں کے گولوں، آگ لگانے والے آلات، ہوائی جہازوں کی بمباری اور آتش باری نے قلعہ جات کی اہمیت کو بہت کچھ بدل دیا۔ اگرچہ مقصد آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ یعنی دشمن کے حملے کو روک کر دم لینے کا موقع حاصل کرنا۔ مگر اس مقصد کے ذرائع پہلے کے مقابلہ میں آج کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ اس مقصد کی جزئیات یہ ہیں :-

اوّل - زمانۂ امن میں دفاعِ ملک کے لئے کم سے کم فوج رکھی جائے۔

دوم - ان قلعوں کی وجہ سے ملک کی زیادہ سے زیادہ فوج اس جگہ جمع کی جا سکے جہاں دشمن نے حملہ کیا ہو یا کرنے کا احتمال ہو۔

سوم - حملہ کی صورت میں دشمن کی نقل و حرکت میں زیادہ سے زیادہ مزاحمت ہو۔ مثال کے طور پر شمالی افریقہ کی جرمن فوج طبروق کو فتح نہ کر سکی اور اتحادیوں کا
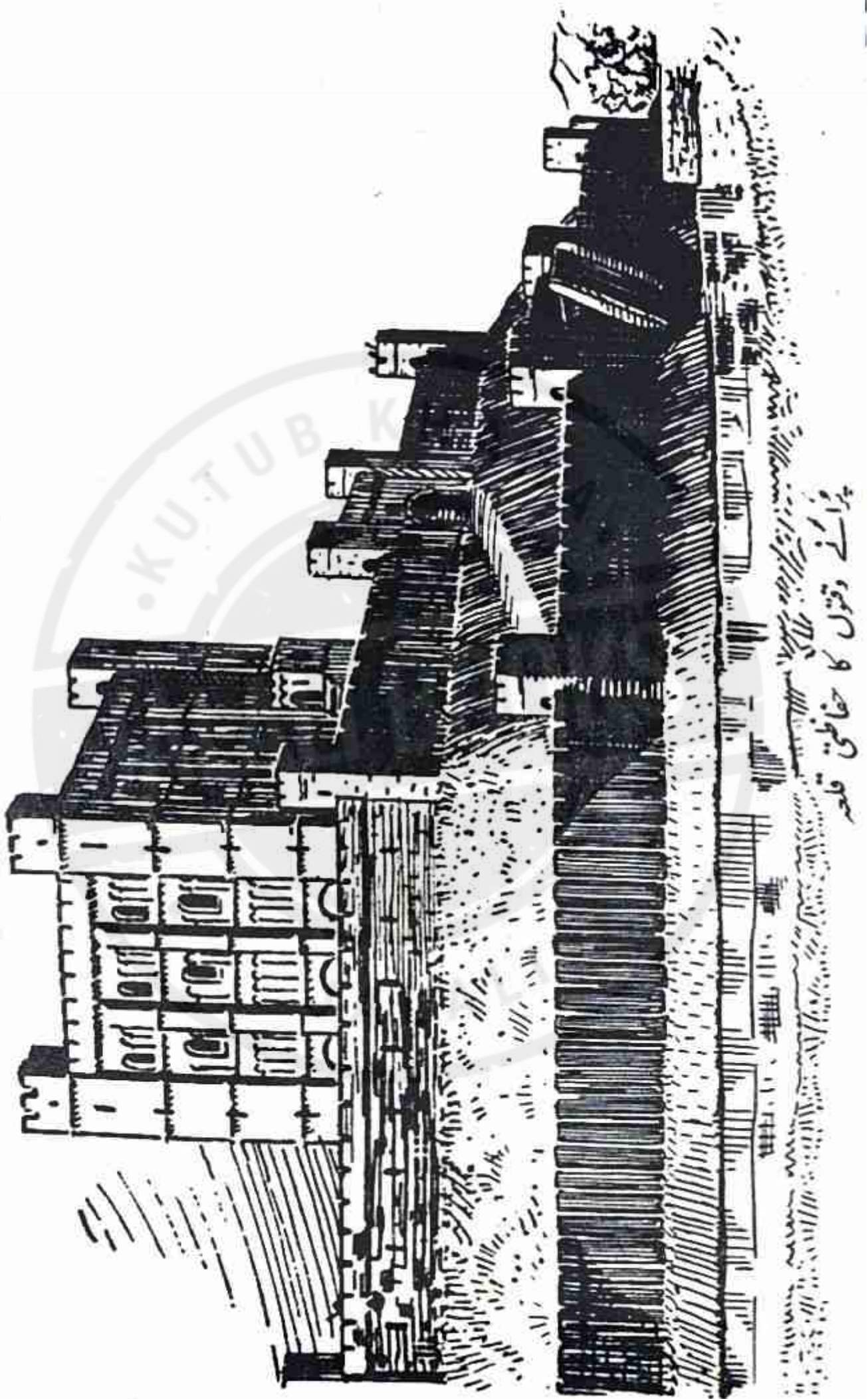
پُرانے وقتوں کا حفاظتی قلعہ

یہ چھوٹا سا قلعہ اور اس کا چھوٹا سا دستہ محوریوں کے پہلو میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا بلکہ اس نے بڑی حد تک جرمنوں اور اطالویوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی فوج چھوٹے سے قلعہ کو بھی دشمن کے مقابلہ میں آخر وقت تک روکے رکھتی ہے تو وہ دشمن کے منصوبہ کی تکمیل میں بڑی مزاحمت پیدا کر دیتی ہے۔ نہ صرف مزاحمت پیدا کر دیتی ہے۔ بلکہ بڑی تبدیلی رونما کر دیتی ہے۔ اگر طبروق کا قلعہ اطالوی فوج کے ہاتھ آجاتا تو بالکل ممکن تھا کہ اطالوی اور جرمن آسانی سے قاہرہ پہنچ جاتے چنانچہ دوسرے محوری حملے میں جب طبروق کا یہی قلعہ جنرل رومیل کے ہاتھ میں آگیا تو دشمن کو اَلاَمین کے مورچہ پر بڑی ہی دشواری سے روکا گیا۔

قلعہ جات کے تحفظ کے بارے میں ایک مرتبہ نپولین نے حکم جاری کیا تھا کہ "ہر قلعہ کے سالار کو یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اس کا قلعہ سلطنت و مملکت کے بنیادی ستونوں میں سے ایک بڑا ستون ہے۔ جس طرح عمارت کا ایک ستون گر جاتا ہے تو وہ خطرے میں پڑ جاتی ہے اسی طرح اگر ایک بھی قلعہ دشمن کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے تو ملک خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ قلعہ کے سالار کو آخر دم تک لڑنا چاہیئے اور اس کا مطلق خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ دشمن فلاں فلاں مقام پر قابض ہو گیا ہے اور مقابلہ بے سود ہے اس کے ساتھ سالار قلعہ کو دشمن کی ترغیب و ترہیب سے بھی متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ اور پوری جان نثاری کے ساتھ آخری وقت تک قلعہ کی حفاظت کرنی چاہیئے۔

یہ بات کس قدر اہم ہے۔ اس کا اندازہ بحیرۂ متوسط میں جزیرہ مالٹا کے مورچہ سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ قلعہ بند جزیرہ دفاعی نقطۂ نظر سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس پر شمالی امریکہ اور جنوب مغربی یورپ کے ملکوں کی عافیت و سلامتی کا بڑا انحصار ہے۔ یہ قلعہ دوسری جنگ عظیم میں آخر وقت تک اتحادیوں کے ہاتھ میں رہا۔ اگر دشمن اس پر قابض ہو جاتا اور اتحادیوں کو شکست نہ بھی ہوتی تو بھی فرانس پر دوبارہ حملہ کرنے میں انتہائی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا اور وہ محوری فوجوں سے جو جنرل رومیل کے ماتحت لڑ رہی تھیں شمالی افریقہ کو خالی نہ کرا سکتے۔ اسی طرح سے جب تک سسلی، مالٹا، سائپرس مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے۔ یورپ کی عیسائی قوموں کے حملے اسلامی مملکت کی بنیاد کو نہ ہلا سکے۔

ہمارے ملک پاکستان کی شمالی مغربی سرحد پر پٹھان انگریزی حکومت سے سنگر

کی پناہ میں تقریباً دو سو سال تک لڑتے رہے۔ سنگر ایک قسم کا دائرہ نما مورچہ ہوتا ہے۔ جسے بڑے بڑے پتھر چن کر بنایا جاتا ہے۔ اس کی دیوار عموماً پانچ فٹ اونچی ہوتی ہے۔ دائرہ نما اس لئے رکھتے ہیں تاکہ مدافعین چاروں طرف گولیاں چلا سکیں۔ برطانوی حکومت کی فوجیں بھی ان سے لڑنے کے لئے ایسے ہی سنگر بناتی تھیں۔ اگر سنگر مستطیل رکھا جاتا تو چاروں کونے ایسے بنائے جاتے کہ اس کے اندر لڑنے والے چاروں سمتوں کو اپنی گولی کی زد میں لا سکیں۔

آسام اور برما کی جنگلی قومیں بانسوں سے ایک خاص قسم کی باڑ بناتی ہیں جسے بڑی ہوشیاری سے لمبی لمبی گھاس سے چھپا دیا جاتا ہے۔ حملہ آور جب اس گھاس میں سے آگے بڑھتا ہے تو اسکی ٹانگیں زخمی ہو جاتی ہیں۔ وہ لوگ اسے پانجی کہتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات اینٹ، پتھر یا اینٹ کے مضبوط قلعوں کے بجائے فوجیں زمین دوز مورچے بناتی ہیں۔ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ میں خصوصاً یورپ کے اندر اور وسط مشرق اور ترکی میں عراق عرب اور دره دانیال میں زمین دوز مورچوں سے خاص کام لیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹-۴۵ء) میں بھی لڑائی کا آغاز اس دفاعی اصول سے ہوا۔ برما میں آخر تک اس سے کام لیا گیا۔ یہاں تک کہ جاپانیوں کے خلاف فلیم تھرور (Flame Thrower) استعمال کیا گیا۔ جس نے انھیں یا تو ان کے زمین دوز مورچوں ہی میں جلا کر خاک کر دیا یا نکل کر بھاگے تو گولیوں کی زد پر رکھ کر ہلاک کر دیا گیا۔

ہالینڈ کے رہنے والے صدیوں سے اپنے ملک کی حفاظت ایسے مورچوں سے کرتے تھے۔ جن کو سمندر کے پانی سے غرق کیا جا سکتا تھا۔ یہ اصول دراصل وہی تھا جو ہندوستان والوں نے اختیار کیا۔ یعنی قلعوں کے گرد خندقیں کھود کر انھیں پانی سے بھر دیتے تھے تاکہ دشمن عبور نہ کر سکے۔ ہالینڈ والوں کو اس دفاعی منصوبہ پر بڑا ناز اور بڑا بھروسہ تھا مگر جب جنگ چھڑی تو جرمنوں نے ایسی دفاعی چال چلی کہ ہالینڈ والے اپنے منصوبہ پر عمل نہ کر سکے۔ اس کی مختصر داستان دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔

مئی کے پہلے ہفتہ میں ہالینڈ کے اندر یہ خبر مشہور ہوئی کہ جرمنی حملہ کرنے والا ہے ۹ مئی کی نصف شب کے بعد جرمن ہوائی جہاز ہالینڈ پر پرواز کرتے دیکھے گئے اس کے تھوڑی دیر بعد اطلاع ملی کہ جرمن چھاتہ فوج ہالینڈ کے مختلف ہوائی اڈوں پر اُتر گئی ہے چھاتہ فوج نے اترتے ہی پانچویں کالم کے ساتھ مل کر نہروں کے تمام اہم

پلوں پر قبضہ کر لیا۔ اس اثناء میں جرمنی کے زرہ پوش فوجی کالم یعنی ٹینک وغیرہ
نے باقاعدہ چڑھائی کر دی اور ۱۴ مئی کو جرمن حکومت نے اعلان کر دیا کہ اگر ہالینڈ
کی حکومت فوراً ہتھیار نہ ڈال دے گی تو ہالینڈ کے تمام بڑے بڑے شہر بمباری کر کے
تباہ کر دیئے جائیں گے۔ اس طرح چند روز کے اندر جرمن نے پورے ملک پر قبضہ
کر لیا۔

ہالینڈ نے قلعے تعمیر کئے، خندقیں بنائیں۔ مگر یہ منصوبہ بنایا کہ عیار دشمن کے
خلاف انہیں کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا قلعے اور خندقیں بیکار ثابت ہوئیں نہ
ملک میں سیلاب لایا جاسکا اور نہ دشمن فوج کی نقل و حرکت میں مزاحمت پیدا
کی جاسکی۔

فرانس کو میجنو لائن پر بڑا ناز تھا۔ یہ دفاعی قلعہ بندیاں بڑی مشہور تھیں۔ مگر ان کا
بھی یہی حشر ہوا۔ اس کی بربادی پر عرصہ تک تبصرہ ہوتا رہے گا لیکن غلطیوں اور کوتاہیوں
کا جو نتیجہ برآمد ہونا چاہیئے تھا۔ وہ بہر حال ہو کر رہا۔ ۱۹۳۹ء میں مصنف بھی اتحادی
فوج میں شامل ہو کر اس مورچہ کی حفاظت کے لئے گیا تھا۔ یہ لائن یا مورچہ دراصل ایک
زمین دوز قلعہ تھا۔ ہندوستان میں اس قسم کے قدیم قلعوں کے آثار اب بھی کہیں کہیں
موجود ہیں مثلاً فیض آباد میں ہنومان گڑھی اور ٹیکسلا کا کھنڈر۔ البتہ یہ قلعہ جدید قسم کا
تھا۔ اس میں بجلی تھی۔ ریل گاڑیاں چلتی تھیں، ہوٹل کھلے ہوئے تھے سینما اور ہسپتال تھے
غرض ہر قسم کی آسائش اور اس کے ساتھ دمدم توپیں اور مشین گنیں اس طرح لگائی
گئی تھیں کہ توپچی اور گولہ انداز بالکل محفوظ تھے۔ مورچوں کی حفاظت کے لئے میلوں دور
تک خاردار تاروں اور ٹینک شکن توپوں کے مورچے تھے۔ دنیا کے دفاعی مبصر اسے
بہت ہی مستحکم مورچہ سمجھتے تھے اور کچھ تو اسے ناقابلِ تسخیر کہتے تھے۔ مگر جب جرمنوں نے
اسے آسانی سے فتح کر لیا تو دنیا حیران و ششدر رہ گئی۔

جب ڈنکرک سے جان بچا کر مصنف انگلستان پہنچا تو بی بی سی (B.B.C.) سے
براڈکاسٹ کرتے وقت ہم نے بھی دوسرے دفاعی مبصرین کی رائے سے اتفاق کرتے
ہوئے کہا تھا کہ اگر میجینو لائن سمندر تک بنادی گئی ہوتی تو دشمن فرانس میں داخل نہ
ہوسکتا۔ ہم نے سنا تھا کہ فرانس یہ توسیع کرنا چاہتا تھا مگر بلجیم کی اس بدگمانی کی بنا پر کہ اسے
فرانس کی دوستی پر بھروسہ نہیں۔ توسیع کے اس منصوبہ پر عمل نہیں کیا جاسکا۔ مگر بلجیم ،

ہالینڈ اور فرانس کے علاوہ دوسرے ملکوں کو بھی اس پر اعتماد تھا کہ ملک کو سیلاب زدہ کر کے اور سمندری بندوں کو توڑ کر دشمن کی نقل و حرکت کو روکا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ فرانس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ میجینو لائن کو سمندر تک بڑھا سکتا تھا، تب بھی اس کے پاس اتنی بڑی فوج نہ تھی جو اتنے طویل مورچہ کی حفاظت کے لئے تعینات بھی کی جا سکتی اور میدان جنگ میں بھی دشمن سے نبرد آزما ہوتی اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ فوج کے لئے آدمی کافی تھے تو ان کے لئے کافی تعداد میں جدید قسم کے ٹینک، توپیں اور بار برداری کی موٹریں نہ تھیں اور ان کا مہیا کرنا آسان نہ تھا۔

لیکن اگر میجینو لائن اتنی ہی ہوتی جتنی کہ تھی۔ مگر فرانس کے پاس زبردست فیلڈ آرمی ہوتی اور وہ جدید ہتھیاروں سے لیس ہوتی تو میجینو لائن ایسی بدنام نہ ہوتی۔ جیسی کہ ہوئی میجینو لائن میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ اس کے اندر سے دشمن پر صرف سامنے سے حملہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس کی کوئی پشت پناہ نہ تھی اور اس پر پیچھے سے بڑی آسانی سے حملہ کیا جا سکتا تھا۔ جرمنوں نے سانپ اور نیولے کی لڑائی کے اصول پر عمل کیا۔ جس طرح نیولہ سانپ کے حملے سے اپنے آپ کو بچا کر پشت کی طرف سے اس کی گردن پکڑ لیتا ہے اس طرح جرمنوں نے میجینو لائن کے ایک طرف سے گذر کر عقب سے اس پر حملہ کر کے فتح کر لیا۔ سنگا پور کی مشہور قلعہ بند بندرگاہ کے سقوط کی بھی یہی وجہ تھی۔ جب جاپانیوں نے سنگا پور پر حملہ کیا تو انہوں نے برطانوی دفاعی مبصروں کے خیال کے برعکس کارروائی کی۔ برطانوی دفاعی مبصرین کا خیال تھا کہ دشمن اس پر سمندر کی طرف سے حملہ کرے گا۔ لہٰذا اس طرف نہایت عمدہ حفاظتی انتظام کیا گیا۔ عقب میں جو وسیع عظیم گھنا جنگل تھا۔ اُسے سب ناقابلِ گذر سمجھتے تھے۔ مگر جاپان نے اپنی فوجوں کو اسی جنگل میں اُتارا اور عقب سے دفعتہً حملہ کر کے اس پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ بالکل اس حملہ کی نقل تھا۔ جو جاپانیوں نے ۱۹۰۵ء میں روسیوں کے خلاف پورٹ آرتھر پر کیا تھا۔ تاریخ اگرچہ بڑی سبق آموز ہے مگر قومیں عموماً اسے فراموش کر دیتی ہیں۔

سرحدات کی حفاظت اور قلعہ جات کی اہمیت اس وقت تک ہے جب دفاعی سیاست کے اصولوں پر ہوشمندی کے ساتھ عمل کیا جائے اور ان کی تعمیر میں اصول و عمل کی مطابقت کا پورا لحاظ رکھا جائے جو قومیں ان قلعہ جات کو دفاعی سیاست کے اصولوں پر مستحکم بنانا چاہتی ہیں۔ وہ عموماً غلطی کرتی ہیں۔ کیونکہ دفاعی اصول ہمیشہ سے اٹل ہیں اور آیندہ بھی اٹل

رہیں گے البتہ عمل کے وسائل اور طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ اگر کسی وقت دفاعی اصولوں کو وقتی طور پر ذرائع کا پابند بھی بنا لیا جائے تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ نئی ایجادات کے منظر عام پر آنے سے یہ وقتی ذریعہ عمل بیکار نہ ہو جائے گا اور دفاعی اصول اپنی جگہ بحال نہ ہو جائیں گے۔

یہ مثالیں ہم نے اس لئے پیش کی ہیں تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جب حکومتیں، چونے، پتھر، لوہے اور سیمنٹ کو پشت پناہ سمجھنے لگتی ہیں۔ اور غیر متحرک عمارتوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے لگتی ہیں تو بربادی کے کنارے پہنچ کر رہتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صحیح اصول و خطوط کیا ہیں۔ جن پر قلعہ جات اور مورچے تعمیر کئے جائیں۔ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے۔

۱۔ قلعہ جات کی تعمیر کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ عام حالات میں حکومت کو ملک کے تحفظ پر کم سے کم روپیہ خرچ کرنا پڑے تاکہ زمانہ جنگ میں وہ ان کو، جن میں زمین دوز قلعے اور دوسرے مورچے شامل ہیں، دشمن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے روکنے کے لئے استعمال کر سکے اور اس طرح جو وقت ملے اسے دفاعی تیاریوں کی تکمیل پر صرف کر سکے۔

۲۔ ان کی مدد سے دشمن کے حملے کا رخ اپنے دفاعی منصوبہ کے مطابق اس طرف موڑ دیا جائے۔ جہاں دشمن کی فوج کو مصائب و مشکلات میں پھنسا کر تباہ کیا جا سکے

۳۔ قلعہ جات اس طرح تعمیر کئے جائیں کہ دفاعی منصوبہ کے مطابق اپنی فوج کے لئے مضبوط مستقروں کا کام دیں تاکہ دشمن انہیں نظر انداز کر کے آگے نہ بڑھ سکے۔ مثلاً ۱۸۔۱۹۱۴ میں درڈن اور ۴۲۔۱۹۴۰ میں طبروق کی لڑائیاں ہوئیں۔

۴۔ قلعے ایسے ہوں کہ دشمن اپنی فوج کو جان جوکھوں میں ڈالے بغیر حملہ نہ کر سکے۔ ان کی پشت پر اور ایسے مورچے اور قلعے ہونے چاہئیں جو ان کے استحکام و استحفاظ کا سبب بن سکیں۔

۵۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہوائی جہاز کی ایجاد اور توپ خانہ کی زبردست تباہ کاری کی طاقت نے قلعہ جات کی اہمیت کم کر دی ہے اور ایٹم بم کی ہولناکیوں نے انجینئروں کو پریشان کر دیا ہے۔ پھر بھی یہ ناممکن ہے کہ کوئی حکومت زمانۂ امن میں جدید پیمانہ پر

تربیت یافتہ اور نئے نئے اسلحہ سے مسلح کسی زبردست فوج کے قیام کے مصارف پر ملکی دفاع کی ایک اطمینان آفریں صورت پیدا کی جاسکتی ہے اور مختصر سی فوج کی مدد سے حملہ آور کو کچھ وقت کے لئے روک کر دفاعی منصوبہ کی تکمیل کی مہلت حاصل کی جاسکتی ہے۔

۶۔ ساحلی سرحدات کے تحفظ کے اصول بھی یہی ہیں۔ بری فوج ملکی سرحد کے پیچھے سے ملک کی حفاظت کرتی ہے۔ بحری فوج ساحل سے دور دشمن کا مقابلہ کرتی ہے اور اگر وہ شکست کھاجاتی ہے تو ساحل کی حفاظت کی ذمہ داری بری و فضائی فوج پر عائد ہوتی ہے ویسے ان تینوں میں ہر وقت تعاون و یک جہتی قائم رہتی ہے اور تینوں مل کر ہی دشمن کا مقابلہ کرتی ہیں۔ بری لڑائی کی طرح ساحل بھی اسی وقت محفوظ رہتا ہے جب اس کی محافظ فوجیں دفاعی مقصد کے حصول کے لئے دشمن پر حملہ کرنے میں پیش قدمی کریں۔

۷۔ یہ بات مدنظر رکھنی چاہیئے کہ ہوائی جہازوں اور ہوائی حملے کے نت نئے طریقوں نے لمبی مار کی ساحلی توپوں کی مدافعتی طاقت کو کمزور کردیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بحری بیڑے کی توپیں آج کل بہت طاقتور ہوتی ہیں۔ تاہم وہ ساحلی توپوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ ساحل کی توپیں مضبوط و مستحکم ہونے کی وجہ سے زیادہ صحیح اور کارگر فائر کرسکتی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں بحری بیڑے کی توپیں سمندری لہروں اور جہاز کی حرکت وجنبش کی وجہ سے برابر ہلتی رہتی ہے۔ لہٰذا ان کا نشانہ اتنا یقینی اور صحیح نہیں ہوتا۔ جتنا ساحلی توپوں کا ہوتا ہے۔ پھر ساحل کی توپیں اب ایسے دور مار گولے چلاسکتی ہیں جو کئی کئی انچ موٹی فولادی چادر کو بھی توڑ دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ساحل کی حفاظت کے لئے خاص قسم کی سرنگیں (Mines) سمندر میں ڈالی جاسکتی ہیں جو بحری جہازوں کے لئے بڑی خطرناک اور تباہ کن ہوتی ہیں ان کا توڑ بحری بیڑے کا امدادی فضائی بیڑہ ہوتا ہے جو ان سرنگوں پر فضا سے حملہ کرکے انہیں تباہ کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ بحری بیڑے میں ایسے جہاز بھی ہوتے ہیں جو ان سرنگوں کو صاف کرنے کا کام کرتے ہیں اور انہیں ایک جگہ سے کھینچ کر دوسری جگہ لے جاتے اور برباد کردیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جہاں ایسے آلات ایجاد ہوچکے ہیں اور ہورہے ہیں۔ جن سے دشمن

کے لئے ساحل پر حملہ کرنے میں آسانی ہو گئی ہے۔ وہاں ایسے آلات بھی ایجاد ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ جن کی مدد سے ساحل کی حفاظت عمدہ طریق پر کی جا سکتی ہے مگر دفاع و تحفظ کے معاملہ میں یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ جدید آلات و اسلحہ جن میں ۱۴ انچ دہانے کی توپ، کانٹیکٹ مائینز (Contact Mines) بھی شامل ہے یا امدادی فضائی بیڑا اس وقت تک ساحل کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ جب تک اس میں پیش قدمی کر کے دشمن پر حملہ کرنے کا جذبہ اور حوصلہ نہ ہو۔ ہٹلر نے فرانس کے ساحل کو ہر طرح مضبوط بنایا۔ ہر قسم کے جدید آلات مہیا کئے۔ قلعہ جات میں سامان جنگ کی افراط اور فوجوں کی کثرت تھی۔ مگر وہ اتحادیوں کو نارمنڈی پر حملہ کرنے سے نہ روک سکا۔ کیونکہ ان کے سالاروں کو اپنے اوپر اور خود ہٹلر کو ان پر اعتماد نہ تھا۔ اس لئے سامان حرب کی بہتات اور فوجوں کی کثرت بے سود ثابت ہوئی۔

کیمیائی جنگ

۱۹۱۴ء کی پہلی عالمی جنگ میں جب ہم[1] ایک فوجی کی حیثیت سے شریک ہوئے ہمیں بلم، تلوار، اور رائفل وغیرہ سے مسلح کیا گیا تھا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تلوار اور رائفل وغیرہ کے ساتھ کیمیائی جنگ بھی لڑی جائے گی۔

جب جرمنی نے فروری ۱۹۱۵ء میں روسی فوجوں کے خلاف دھواں گیس (Cloud Gas) استعمال کی تو اتحادیوں میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے گیس کی لڑائی کے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے حتیٰ کہ جب ایک برطانوی جاسوس عورت نے جرمن فوجوں کے کیمپ کے قریب گیس کے سلنڈر دیکھے اور اس کی اطلاع برطانوی دفتر جنگ کو دی تو اسے ڈانٹ دیا گیا اور یہ تاکید کی گئی کہ وہ اپنے کام کو دفاعی کاموں تک محدود رکھے اور تجارتی شعبدوں سے کوئی دلچسپی نہ لے۔

فرانس کا محکمہ دفاع برطانوی دفاع سے بھی زیادہ لاپروا ثابت ہوا۔ جب مارچ ۱۹۱۵ء میں اسے گیس کے کئی درجن سلنڈر زیلی بیک (Zillebeke) کے مقام کے قریب ملنے کی اطلاع ہوئی تو ان میں اس نے کوئی دلچسپی نہیں لی!

آج کل کیمیائی جنگ کا مسئلہ اگرچہ مختلف الخیال لوگوں کی بحث و گفتگو کا موضوع بنا ہوا ہے اور مختلف ممالک کے اخبارات اپنے ملکوں کی رائے عامہ کے مطابق اس پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ان کے دفاعی مبصرین اور حکومتیں خاموش ہیں۔ لہٰذا یہ بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ آئندہ لڑائیوں میں کیمیائی جنگ کی اجازت ہوگی یا نہیں۔ ایسی صورت میں اس مسئلہ پر قلم اٹھانا بھی آسان نہیں۔ مگر چونکہ اس کی اہمیت

[1] مصنف

سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس کے باوجود اس پر اظہار خیال ضروری معلوم ہوتا ہے ناظرین کو اختیار ہے کہ حالات و واقعات کو سامنے رکھ کر اپنی رائے قائم کریں۔

موجودہ زمانے کی صنعتی ترقیوں کی وجہ سے کیمیائی جنگ کی گیسوں اور جراثیمی بموں کی تیاری دوسرے اسلحہ کے مقابلے میں آسان بھی ہے اور کم خرچ بھی۔ اگرچہ ایٹم بم کی تیاری میں اس وقت کافی محنت اور سرمایہ لگ رہا ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب یہی ایٹم بم مختلف نئے تجربات کے بعد کم قیمت پر بننے لگے گا۔ کیونکہ اس قسم کے سامان جنگ کا تعلق براہ راست صنعتی ترقی سے ہے۔ نئی نئی ایجادات و اکتشافات کا سلسلہ جس طرح اب تک جاری رہا ہے۔ اسی طرح آئندہ جاری رہے گا۔ لہذا، ایٹم بم یا ہائیڈروجن کی کم لاگت پر تیاری کی پیشگوئی بعید از قیاس نہیں۔ اس قسم کے آلات سے چونکہ دفعتہً کامیاب حملہ کیا جا سکتا ہے۔ لہذا وہ ملک اور وہ قومیں جو ان ایجادات کی سرمایہ دار ہیں۔ ان کے استعمال کا کوئی نہ کوئی حیلہ ضرور تلاش کر لیتی ہیں۔ چنانچہ امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم پھینکنے کی اسی طرح وجہ پیدا کر لی۔ اور ساری دنیا کو اسے تسلیم کرنا پڑا۔ اب خواہ یہ تسلیم کرنا نمائشی ہو یا حقیقی۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے کسی ایک ملک نے بھی آج تک اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔

پہلی عالمی جنگ میں فرانس میں گیس کا نہایت شدت کے ساتھ استعمال کیا گیا تھا اس لڑائی کے تجربات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے اسلحہ کے مقابلے میں گیس کا استعمال اگرچہ کارگر رہا۔ مگر دفاعی مبصرین نے اس پر بہت ہی کم توجہ دی۔

اپریل ۱۹۱۵ء میں جب جرمن حملے کا سیلاب قریب رک چکا تھا۔ اتحادیوں کی بحری ناکہ بندی نے جرمنی کو سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا۔ لہذا اس سیلاب کو پھر پوری قوت سے جاری کرنے کی غرض سے ۲۲ اپریل ۱۹۱۵ء کو جرمنی نے کلورین (Chlorine) گیس استعمال کی اس سے اتحادیوں کے پانچ ہزار سپاہی ہلاک اور دس ہزار زخمی ہوئے اس حملے نے دنیا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ مگر خود جرمن دفاعی مبصرین کو گیس کے استعمال پر اعتماد نہ تھا۔ لہذا نہ تو یہ کافی مقدار میں تیار ہوئی اور نہ کسی اچھے دفاعی منصوبے کے ماتحت اس سے کام لیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ اتحادی بہت بڑی اور فیصلہ کن شکست سے بچ گئے۔

گیس کے اس حملے کے بعد جرمنی اور اتحادیوں نے ایک دوسرے کے خلاف کئی

دفعہ مختلف قسم کی گیسیں استعمال کیں لیکن چونکہ طرفین کے پاس میدان جنگ میں گیس کے ماہرین نہ تھے اور مقامی حالات سے ناواقفیت کی دشواری بھی ان کے استعمال میں بہت کچھ حائل تھی۔ اس لئے کسی کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ ان دنوں جو گیسیں استعمال کی گئیں۔ وہ یہ تھیں۔

(ا) کلورین:۔ پہلے اسے اکیلے استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد دھوئیں کے ساتھ ملاکر سلنڈروں اور مارٹر (Mortar) توپ میں استعمال کی گئی۔ اس گیس کا بنانا بھی آسان ہے اور لاگت بھی بہت کم آتی ہے۔ اگر اس گیس کا ایک حصہ ہوا کے دو ہزار حصوں میں شامل ہو جائے اور دو منٹ تک اس میں سانس لی جائے تو نتیجہ نہایت خطرناک ہوتا ہے۔

(ب) فاسوجین گیس (Phosogene Gas) کا اگر کلورین سے پانچواں حصہ استعمال کیا جائے تو نتیجہ اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ گیس رنگ تیار کرنے میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ گذشتہ جنگ میں یہ بہت زیادہ استعمال ہوئی۔ اس کا اثر پھیپھڑوں پر ہوتا ہے۔

(ج) کلورارسین (DM = Chlorarsine) جسے ڈی ایم بھی کہتے ہیں۔ اگر اس گیس کے ایک حصہ کو ہوا کے ایک کروڑ حصوں میں شامل کرکے فوجیوں کے خلاف استعمال کیا جائے۔ تو وہ کئی گھنٹے کے لئے بالکل معطل ہو جائیں گے۔

بعد میں فاسوجین گیس دوسری گیسوں میں ملاکر استعمال کی گئی۔ اس کا اثر چونکہ پھیپھڑوں پر ہوتا ہے۔ مگر اس سے متاثر شدہ انسان کلورین گیس کے اثر کے مقابلے میں کم کھانستا ہے لیکن بغیر کسی ظاہری علامت کے دفعۃً گر کر مر جاتا ہے۔

فاسوجین چونکہ سلنڈروں میں استعمال نہیں ہو سکتی اور جاڑے کے موسم میں اس کے جم جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے فاسوجین کو کلورین کے ساتھ ملاکر کام میں لایا گیا اور اس کا نام وہائٹ اسٹار (White Star) رکھا گیا۔

(د) کلوروپیکرین (Chloropicrine) ۱۹۱۷ء میں استعمال کی گئی۔ اس کا بھی پھیپھڑوں پر بہت برا اثر ہوتا ہے۔ اور ان میں پانی بھر جاتا ہے۔ پھیپھڑوں کے علاوہ اس سے آنکھیں بھی بہت متاثر ہوتی ہیں۔ اس کے ہلکے سے اثر سے مریض کو کھانسی اور متلی ہونے لگتی ہے۔ جس کی وجہ سے سانس لینے کا نقاب (Respirator)

اُتارنا پڑتا ہے اور اس کے اُتارنے سے اور بھی زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں اس کے ساتھ فاسوجین گیس ملا کر استعمال کی گئی تھی۔

(س) گرین اسٹار (Green Star) یہ دو گیسوں کا مرکب ہوتی ہے۔ اس میں ۶۵ فیصدی کلور و پکرین ہوتی ہے۔ اور ۳۵ فی صدی سلفر ٹیڈ ہائیڈروجن (Sulphureted Hydrogen) یہ اشک آور ہوتی ہے چھینکیں لاتی ہے اور پھیپھڑوں میں خراش پیدا کرتی ہے۔ لیکن اس سے آبلے نہیں پڑتے۔

(ش) اشک آور گیس دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک کیپ (Cap) کہلاتی ہے اسے عام طور پر پولیس استعمال کرتی ہے یہ میدان جنگ کے لئے موثر نہیں لیکن کسک (Ksk) جو فضا میں دیر تک رہتی ہے۔ بڑی موثر اور خطرناک ہے۔ اس کا اثر اس کی بو محسوس ہونے سے پہلے ہی ہونے لگتا ہے اور خوراک کی چیزوں پر بھی ہوتا ہے۔ جس سے وہ زہریلی ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے بنانے پر لاگت بہت آتی ہے۔ مگر اشک آور گیسیں مہلک نہیں ہوتیں۔

(ص) جو گیس ہوائی جہازوں سے پھیلائی جاتی ہے۔ اسے بی بی سی (B.B.C.) کہتے ہیں اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ اور اگر فضا میں سکون ہو تو کئی کئی دن تک رہتا ہے۔

(ض) آرسین (Arsine) پاؤڈر کی شکل میں ہوتا ہے۔ اسے آسمان سے اس وقت گرایا جاتا ہے۔ جب بارش ہو رہی ہوتی ہے۔ یا فضا اور زمین نم دار ہوتی ہے۔ نمی کی وجہ سے پوڈر میں سے نہایت خطرناک زہریلی گیس نکلتی ہے۔ اس کا تدارک بہت مشکل ہے

(ص) مسٹرڈ (Mustard) گیس۔ اسے جرمنوں نے سب سے پہلے استعمال کیا تھا اور اس کا نام ییلو کراس (Yellow Cross) رکھا۔ مگر چونکہ فرانس میں نوجیوں نے رائی کی سی بو کی وجہ سے اس کا نام مسٹرڈ رکھا تھا۔ اس لئے یہ اسی نام سے مشہور ہو گئی۔ اس کی بو دراصل لہسن کی بُو کی طرح ہوتی ہے۔ یہ ایسے تیل سے نکالی جاتی ہے جس کا رنگ گہرا بادامی ہوتا ہے۔ اس کا استعمال دشمن کے خلاف دوسرے گیسوں کی طرح نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تیل ہی ہوتا ہے جو پھینکا جاتا ہے۔ اس میں سے بہت دیر تک گیس نکلتی رہتی ہے۔ جو جسم کی جلد میں سرایت کر کے چربی میں مل جاتی ہے۔ عام لباس میں سے دس منٹ کے اندر گذر کر جلد پر پہنچ جاتی ہے اور اس کا اثر شروع ہو جاتا ہے

پانی کا اثر اس پر بہت کم ہوتا ہے۔ البتہ کلورین پاؤڈر سے اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے اس سے جسم کو بہت نقصان پہنچتا ہے اور بیک وقت بہت سے آدمی بہت عرصہ کے لئے بیکار ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ میں اس گیس سے متاثر ہونے والے صرف ۲ ½ فیصدی ہلاک ہوئے۔ مگر اس کا اثر آنکھوں پر بہت برا ہوتا ہے اور آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ اگر سپاہی رات کے وقت کام کر رہے ہوں اور اس کا اثر ان کے کپڑوں اور جوتوں پر ہو گیا ہو اور نادانستہ طور پر اپنے خیموں یا مورچوں میں چلے جائیں تو ان کے ساتھ ان کے ساتھی بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس گیس سے جسم پر چھالے پڑ جاتے ہیں اور اگر اس کے تیل کا ذرا سا قطرہ آنکھ میں پڑ جائے تو بینائی ختم جاتی رہتی ہے۔

(ط) لیویسٹ (Lewisite) یہ گیس امریکہ کی ایجاد ہے۔ اس سے جسم پر آبلے پڑ جاتے ہیں۔ انتہائی زہریلی گیس ہے۔ لیکن فضا میں دیر تک نہیں ٹھہرتی۔ پانی کے استعمال سے اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

گیس چونکہ دشمن کے سپاہیوں کو ناکارہ کرنے اور دشمن فوج کو اپنے اداروں سے باہر رکھنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے لہذا آبلے ڈالنے والی گیس سے یہ مقصد بڑی عمدگی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ گیس کے استعمال کے کئی طریقے ہیں:-

۱۔ سلنڈروں میں بھر کر پھینکنا۔ یہ سلنڈر مقررہ مقام پر پھینکے جاتے ہیں۔ یا رکھ دیئے جاتے ہیں اور ان میں سے گیس نکلتی رہتی ہے۔ ایسی صورت میں ہوا کے رخ کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۲۔ جنریٹرس (Generators) ان میں سے دھوئیں کی طرح سے گیس نکلتی ہے۔

۳۔ گولے جو توپ یا مارٹر سے چلائے جاتے ہیں۔

۴۔ مائنز (Mines) یا سرنگ اور بم جو ہوائی جہاز سے گرائے جاتے ہیں۔

۵۔ ہوائی جہاز سے برسائی جا سکتی ہے۔ ہوائی جہاز سے برسائی ہوئی گیس کا ڈیٹکٹر کے ذریعہ پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ ڈیٹکٹر پر گیس کا اثر ہوتے ہی اس کا رنگ جو زرد ہوتا ہے سرخ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

گیس کے اثر سے تحفظ کے لئے گیس کا ریسپیریٹر (Respirator) آلۂ تنفس جو آنکھوں اور پھیپھڑوں کی بہت سی گیسوں کی پوری پوری حفاظت کرتا ہے۔ مسٹرڈ

گیس سے جسم کی جلد کو بچانا تو دشوار ضرور ہے مگر بالکل ناممکن نہیں۔ یہ گیس زیادہ تر ٹھنڈی اور نم دار جگہوں اور بالخصوص جنگلات میں کئی کئی دن تک اپنے خطرناک اثرات کے ساتھ موجود رہتی ہے۔ لیکن اگر کلورین پوڈر کو اس پر ڈال دیا جائے تو اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ گیسوں میں مختلف قسم کے خطرناک اجزا بڑی آسانی سے شامل کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً جراثیم جو بہت مہلک اور خطرناک قسم کی متعدی بیماریوں کا باعث ہو سکتے ہیں۔

دنیا کے موجودہ حالات میں کیمیائی جنگ کے متعلق اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اقوام عالم نے جنیوا گیس پروٹوکول ۱۹۲۵ء پر دستخط کئے ہیں۔ لیکن جاپان اور امریکہ دستخط کنندوں میں شامل نہیں۔ اٹلی شامل ہوا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس نے ۱۹۳۵ء میں حبشہ کے خلاف گیس استعمال کی مطلب یہ کہ ان اقوام میں سے اکثر نے اس عہد نامہ کی پابندی اس وقت تک کی۔ جب تک ان کی مصلحتوں کا تقاضا اس کے خلاف نہ ہوا۔ لیکن جہاں معاملہ دوسرا ہوا۔ کوئی نہ کوئی حیلہ تراش کر اسے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

۱۹۳۹ء میں جب مصنف امدادی فوج کے ساتھ شریک جنگ ہونے کے لئے فرانس پہنچے تو ہر سپاہی کے پاس گیس کے حملہ سے بچنے کا پورا سامان موجود تھا۔ جسے وہ ہر وقت اپنے پاس لئے پھرتا تھا۔ دفاعی مبصرین کو یقین تھا کہ اس مرتبہ گیس ضرور استعمال ہوگی مگر ایسا نہ ہوا۔ اگر تیسری عالمگیر جنگ بھی دوسری عالمی لڑائی کی طرح لڑی گئی۔ یعنی فریقین کی فوجیں کھلے میدانوں میں متصادم ہوئیں تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ گیس کا استعمال ہوا بھی تو بڑے پیمانہ پر نہ ہوگا۔ کیونکہ فوجیں اپنے مورچے اس قدر جلد بدلیں گی کہ اُن کے لئے کافی مقدار میں گیس مہیا کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ لیکن اگر ایک فریق دوسرے کی غیر مصافی آبادی کے خلاف آتشیں گولے اور وی (V) بم وغیرہ برسا سکتا ہے۔ تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بڑے بڑے شہروں، فیکٹریوں اور ریلوے اسٹیشنوں وغیرہ پر گیس یا جراثیم کے گولے توپوں یا ہوائی جہازوں سے پھینکے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ عوام کیمیائی جنگ کی اہمیت کو سمجھیں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ صدر ٹرومین جیسے شخص نے اپنے صدارتی منصب سے علیحدگی کے وقت اپنے وداعی پیغام میں اس کی دھمکی دی ہے اور کہا ہے کہ امریکہ کے پاس زبردست ہائیڈروجن بم موجود ہے جو ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اگر روس نے اعلان جنگ کیا تو اس کی

اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔ یہ گویا اسی دھمکی کا اعادہ ہے جو انہوں نے ۱۶ار اگست ۱۹۴۵ء کو ایک تقریر میں دی تھی اور جس میں کہا تھا کہ اگر جاپانیوں نے فوراً ہتھیار نہ ڈال دیئے تو ہم اس پر آسمان سے موت کی آگ برسائیں گے اور یہ ایسی تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوگی جس کی مثال دنیا میں نہیں ملے گی؟ چنانچہ یہی ہوا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی میں بے شمار جاپانی مارے گئے۔ جنرل آرنلڈ کے قول کے مطابق ۸ لاکھ ۶ ہزار جاپانی دونوں شہروں میں ہلاک ہوئے۔ واضح رہے کہ ان شہروں کی اہمیت فوجی نقطۂ نظر سے اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ غلہ کی بڑی منڈیاں اور گنجان آباد شہر تھے۔

اگر اتحادیوں کی طاقتور اور مہذب فوجیں ایک جنگ میں اپنی جانیں بچانے کے لئے دوسرے شہروں اور ان کے ساتھ کم وبیش ۶۶ دیہات کو جلا کر راکھ کر سکتی ہیں تو آئندہ بھی اس قسم کی کارروائی کا اعادہ ناممکن نہیں۔ کوریا میں روس نے امریکہ پر جراثیمی بم پھینکنے کا الزام عائد کیا ہے۔ یہ الزام کیمیائی جنگ کے امکان کو اور بھی بڑھا دیتا ہے پھر ایسی صورت میں جبکہ ہمارے سامنے ۷ر جنوری ۱۹۵۳ء کا وہ پیغام بھی موجود ہے جو صدر ٹرومین نے اپنے عہدہ سے سبکدوشی کے وقت جوزف اسٹالن کو بھیجا تھا۔ اس کا ضروری حصہ یہ ہے :۔

مقام اینوٹیک (Enwetek) میں امریکہ نے جو تجربات کئے ہیں۔ ان میں ہم نے دنیا کی ہلاکت و بربادی کا سبب بننے والے ایٹمی اسلحہ کی ایجاد میں نمایاں ترقی کی ہے۔ آج سے انسان تباہی و بربادی کی ماہیت کے ایسے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔ جس کے سامنے ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے شہروں کی تباہی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ ان حالات کو مدنظر رکھ کر مسٹر اسٹالن میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ .... لڑائی لڑنے کے طریقے اب بالکل نئے اور انوکھے بن گئے ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں کی وسعت زبردست ہوگئی ہے اور اب تمہاری حکومت اور تمہارے سارے ملک کو نیست ونابود کر دینا بہت آسان ہے ......" یہ الفاظ گو تحکمانہ ہیں مگر ان سے وثوق واعتماد بھی پوری طرح ظاہر ہو رہا ہے۔

اس کے ساتھ اگر امریکہ کے مختلف دفاعی مبصرین اور سیاسی رہنماؤں کے بیانات کو سامنے رکھتے ہیں تو کشمکش و پیچ میں پڑ جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بیانات میں ایک دوسرے کی تائید کے ساتھ بالتکرار کہا ہے کہ روس کے پاس امریکہ سے کہیں زیادہ

بڑی ہوائی طاقت ہے اور وہ ایٹم بم بنانے کے راز سے بھی واقف ہے۔
بہرحال یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ روس کے پاس وہ سب گیسیں موجود ہیں۔ جو اس کے مخالفوں کے پاس ہو سکتی ہیں۔ ان میں چند گیسیں ایسی بھی ہیں۔ جن کے سامنے موجودہ آلۂ تنفس یعنی ریسپیریٹر (Respirator) بیکار ہے مثلاً ریڈیو ایکٹیو ڈسٹ (Radio Active Dust Poison) ایسی ہلاکت خیز گیس اور جراثیم پیدا کر سکتا ہے۔ جس کے اثرات سے وسیع ترین علاقہ میں بربادی و ہلاکت پھیل سکتی ہے۔ اگرچہ ان اثرات کے ماتحت موجودہ آلۂ تنفس سے پھیپھڑے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ مگر باقی جسم کی حفاظت کے سوال کا کوئی جواب نہیں۔ یہ گیس نہ بودار ہوگی اور نہ آنکھ سے نظر آنے والی۔ مگر اس کے اثرات مہینوں نہیں برسوں تک اس علاقہ میں موجود رہیں گے۔ روس کے پاس اس قسم کی گیس کے استعمال کے لئے ہوائی جہاز موجود ہیں۔
گیس کے استعمال کے سلسلے میں بین الاقوامی دفاعی قوانین جو ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ان کا لب لباب یہ ہے:-
۱۔ اگر گیس کے استعمال کی پابندیاں عملاً اُٹھ گئی ہوں اور یہ صورت حال عموماً اس وقت ہوتی ہے۔ جب دشمن نے ہمارے خلاف گیس استعمال کی ہو تو اسے نہایت کارآمد طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اس کے استعمال سے اس کا نقصان کیا جا سکتا ہے اور اس طرح وہ میدان جنگ میں معطل ہو جاتا ہے۔ دشمن کو مجروح کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ مثلاً آبلے پیدا کرنے والی، دم گھوٹنے والی، آنسو بہانے والی، اور جراثیمی گیس سے مہلک امراض پھیلانے کے لئے دشمن کے پانی اور خوراک کو مسموم کرکے اس کے دفاعی منصوبے کو درہم برہم کیا جا سکتا ہے۔
۲۔ موجودہ فوجی تربیت میں فوجی دستوں کو گیس سے بچنے کے طریقے سکھلائے جاتے ہیں اور گیس کے اثرات کو کم یا زائل کرنے کے منصوبے سالار خود بناتا ہے
۳۔ ہر بڑے فوجی دستے مثلاً بریگیڈ یا ڈویژن کے ساتھ ایک دستہ دشمن کے گیس اور دیگر کیمیائی اسلحہ کے استعمال کے بارے میں چھان بین کرتا اور ان کے اثرات کو دور کرنے اور گیس کے جوابی حملوں کا منصوبہ تیار کرکے اپنے سالار کو پیش کرتا ہے۔
ایٹم کی خصوصیتوں کے متعلق ۱۹۲۵ء میں سائنس دانوں کو کچھ علم تو تھا، مگر چونکہ

اس کے استعمال کی طرف کسی حکومت کی توجہ نہ تھی۔ لہٰذا اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ مگر دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے کچھ دنوں پہلے جرمنی کے سائنسدانوں نے اس طرف توجہ کی اور ان کے تجربات بڑے اہم نتائج پر منتج ہوئے۔ اس کے بعد برطانوی فرانسیسی اور دوسری قوموں کے سائنسدانوں نے بھی تجربات کا سلسلہ شروع کیا اور بغیر کسی قید و بند کے نتائج کی کیفیت عوام کے سامنے آنے لگی۔ جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی اور اس سلسلے کی ایجادوں کو مشتہر کرنے پر پابندی عاید کی گئی تو بہت سی قوموں خصوصاً فرانسیسیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ بہرحال ۱۹۴۰ء تک یہ بات سب کو معلوم ہوگئی کہ یورنیم (Uranium) اور (Thorium Nuclei) کو جب نیوٹران (Neutrons) کے زیراثر مخصوص طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔ تو یہ نہایت چھوٹے مگر مساوی مادی اجزا میں شق ہوجاتا ہے اور اس طرح شق ہونے سے نہایت زبردست طاقت (Energy) پیدا ہوتی ہے۔ جرمن سائنسدانوں کے تجربات اسی اصول پر مبنی تھے۔ انہوں نے ناروے میں ایک فیکٹری قائم کی تھی۔ جب یہ خبر امریکہ، برطانیہ، کناڈا اور ڈنمارک وغیرہ کو ہوئی تو ان کے سائنس دانوں نے بھی بڑی تندہی سے تجربات شروع کئے۔ ان کے تجربات درجۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے۔ مگر انہیں خوف یہ تھا کہ جو بم دشمن پر گرایا جائے اگر وہ کسی خامی یا نقص کی وجہ سے نہ پھٹا۔ تو ہمارے قیمتی راز دشمن کو معلوم ہوجائیں گے۔ اس سلسلے کے ایک تجربہ پر پچاس کروڑ پونڈ سے زیادہ رقم خرچ ہوئی تھی۔ جاپان پر دو بم گرائے گئے تھے U235 ہوروشیما پر اور اس کے تین روز بعد پلاٹونیم (Plutonium) قسم کا ناگاساکی پر جو پہلے بم سے زیادہ خوفناک و ہلاکت آفرین تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اب ایٹم بم کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ سے دوسرے آلات جنگ اس کے مقابلے میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو وی ٹو (V²) کے سامنے تیر و تفنگ کی تھی۔ لیکن جو حملہ آور ایٹم بم کو زیادہ استعمال کریگا وہ نہ مفتوحہ علاقہ سے مال غنیمت حاصل کرسکے گا۔ اور نہ کوئی تاوان جنگ وصول کرسکے گا۔

ایٹم بم ایسے ہوائی جہاز سے بھی گرایا جا سکتا ہے۔ جو ریڈیائی لہروں سے پرواز کرتا ہے۔ راکٹ کے ذریعہ بھی۔ ان دونوں طریقوں سے اس کو راڈر کی مدد سے منزل مقصود پر پہنچایا جا سکتا ہے مثلاً اگر ایک حکومت دوسری حکومت کے خلاف اعلان جنگ سے

قبل چند بم گرا دیتی ہے تو لاکھوں قابل انسان اور فوجیں تباہ ہو جائیں گی۔ سابق صدر ٹرومین کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اگر امریکی ہوا باز ماسکو، اسٹالن گراڈ اور دوسرے روسی شہروں پر چند ایٹم بم گرا دیتے ہیں تو یہ شہر خموشاں میں تبدیل ہو جائیں گے اور ان کے باشندوں کے ساتھ روسی حکومت بھی ختم ہو جائے گی۔

ایٹم بم سے تحفظ کے لئے جو دفاعی ایجادات اب تک منظر عام میں آئی ہیں۔ ان میں سب سے اہم امریکہ کی ہے اور وہ اسٹراٹوسفیر کینن (Strastosphere Cannon) ہے۔ یہ ایسی توپ ہے جو راڈر کی مدد سے چلائی جاتی ہے اور اس کا آلہ جسے (Electronic Brain) کہتے ہیں۔ بجلی کی مدد سے چلتا ہے۔ اس سے آسمان پر پچاس پونڈ وزن کا گولہ چلایا جاتا ہے جو فضا میں بارہ میل سے بھی زیادہ دور جاتا ہے۔ اس گولے کو ایک اور کارتوس چلاتا ہے۔ فضائی جنگ میں اس اصول پر V^2 کے خلاف توپیں چلائی گئی تھیں۔ گو اس کا نتیجہ اطمینان بخش تھا۔ پھر بھی کئی V^2 بم لندن پر اور اس کے نواحی علاقے پر گرے۔ اگر جرمنی نے اس کے بجائے ایٹم بم استعمال کئے ہوتے تو ایک یا دو بم لندن کی مکمل تباہی کے لئے کافی ہوتے۔

لیکن جب ہائیڈروجن ایٹم (Hydrogen Atoms) کو دشمن کے خلاف استعمال کیا جائے گا تو اس کی طاقت بھاری سے بھاری ایٹم بم کی طاقت سے بھی کئی گنی زیادہ ہولناک اور تباہ کن ہوگی۔ قیاس یہ ہے کہ ہائیڈروجن ایٹم بم دوسرے ایٹم بم سے کم از کم دس گنا زیادہ طاقتور ہے اور کئی سو مربع میل کے علاقہ کو بیک وقت تباہ کر سکتا ہے۔

ہائیڈروجن سستی اور عام چیز ہے اور آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ مگر ہائیڈروجن بم میں جو ہائیڈروجن استعمال کی جاتی ہے وہ بہت ہی کمیاب ہے اور اس کا بنانا بھی انتہائی دشوار ہے۔ اگر ایٹم اور ہائیڈروجن ایٹم کو صنعتی کاموں میں استعمال کیا گیا تو دنیا میں زبردست انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ مثلاً بڑے بڑے پہاڑ اڑا دیئے جا سکیں گے اور راستے بنائے جا سکیں گے۔ آئس لینڈ وغیرہ جیسے خنک اور برفانی خطوں کو قابل رہائش بنایا جا سکے گا۔ بار برداری سفر اور کاروبار میں محیر العقول کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ بڑے بڑے ملکوں کے ارباب اقتدار و سیاست کے سروں پر جنگ کا بھوت سوار ہے اور دنیا تباہی کے راستے پر جا رہی ہے۔ اس لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا حشر کیا ہوگا۔ عام طور پر نہ اس کا احساس کیا جا رہا ہے نہ کسی فکر و تشویش کا اظہار ❖

ہوائی جہاز

اب ہم یہ بتا دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہوائی جہازوں کا محکمہ جس کو جنم لئے ہوئے تقریباً تیس برس ہوئے ہیں کس طرح سے ظہور میں آیا۔ وہ امور جن میں محکمہ ہوائی جہاز اب بحری اور بری فوج کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ تیس برس ہوئے خصوصی طور سے بحری اور بری فوجوں کے ذمہ تھے۔ مثلاً آج کل ہوائی جہاز کا محکمہ کبھی تو ان فوجی دستوں سے مل کر اپنے وطن کی حفاظت میں اہم حصہ لیتا ہے اور کبھی بڑے دفاعی منصوبے کے تحت دشمن ملک کے اہم اڈوں پر بم برسا کر تباہی و بربادی برپا کرتا ہے۔ کبھی ان فوجوں کے شانہ بہ شانہ دشمن کے خلاف لڑتا ہے اور کبھی فوجی دستوں، زخمیوں، سامان حرب وغیرہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نہایت تھوڑے عرصہ میں پہنچاتا ہے۔

ماضی میں ملک کو دشمن کے اچانک حملے سے بچانے کے لئے حکومتیں اپنی اپنی سرحدوں پر قلعے اور چوکیاں بناتی تھیں۔ جہاں سے پیدل۔ گھوڑے سوار۔ شتر سوار مچانوں پر بیٹھے ہوئے نقارچی وغیرہ آنے والے خطرات سے اہل ملک کو خبردار کیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ غباروں کی ایجاد ہوئی تو ان کی پرواز کی بلندی سے فایدہ حاصل کیا گیا۔ کبوتر اور پتنگ بھی خبررسانی کے لئے استعمال کئے گئے۔ سنہ ۱۸-۱۹۱۴ء میں جب پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو اس وقت تک ہوائی جہاز کے محکمہ نے اپنے فن میں اس قدر ترقی کر لی تھی کہ ہوائی جہازوں کو دشمن کے متعلق خبریں حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا گیا کہ دشمن کی فوجیں کہاں ہیں اور کس طرف بڑھ رہی ہیں۔ ہوائی جہازوں نے اس جنگ میں توپخانے والوں کو گولہ اندازی اور دشمن پر تباہی لانے میں بڑی مدد دی۔ مگر اس جنگ کے آغاز سے کئی برس تک یہ محکمہ محض ایک امدادی دستہ کے طور سے کام کرتا رہا۔ مگر جوں جوں جنگ طول پکڑتی گئی اور نئی نئی ایجادوں

مختلف قسم کے جنگی طیارے

نے اس فن کو روز افزوں ترقی دی تو ہوائی جہازوں کو بھی دشمن کے اڈوں پر بم برسانے اور تباہی لانے میں استعمال کیا گیا۔ بڑے بڑے فوجی افسروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے ہوائی جہازوں سے کام لیا گیا اور اس طرح جنگ کے حالات نے پلٹا کھایا اور جب یہ محکمہ بہت بڑا بن کر جوان ہوگیا تو اسے علیحدہ کر دیا گیا۔ یہ محکمہ اب سن بلوغ کو پہنچ گیا ہے۔ اس لئے اس کا کمانڈر انچیف بھی الگ مقرر ہوا اور اس محکمے کے مختلف دستے بنائے گئے تاکہ یہ دستے اپنے اپنے منصوبوں کو باقاعدگی اور ترتیب کے ساتھ خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔ بالفاظ دیگر جس طرح سے بری فوج میں مختلف دفاعی فرائض کو انجام دینے کے لئے رسالے، پلٹن (پیدل فوج) توپخانہ اور بار برداری وغیرہ وغیرہ کے مختلف دستے ہیں اسی طرح ہوائی جہازوں کے محکمے میں بھی مختلف دستے بنائے گئے۔

نئی ایجادیں جدید سے جدید قسم کے جہاز بنانے میں مصروف ہیں اور یہ نئے جہاز بنتے رہیں گے۔ مگر ان کو اپنے اپنے دستوں میں استعمال کیا جائے گا۔ لہذا اب ہم ان مرتب شدہ دستوں سے آپ کا تعارف کراتے ہیں۔ اور آپ کو مختلف قسم کے جہازوں کے سمجھانے کی زحمت نہ دیں گے۔ اس طرح آپ بنیادی اصولوں کو سمجھ لینے کے بعد ان جدید ایجادوں کے استعمال کو صحیح طور سے سمجھ سکیں گے۔ یہ سب دستے ایک بڑی مشین کے پرزوں کی طرح سے ہیں۔ لہذا سب پرزوں کا صحیح صورت اور درست حالت میں ہونا ضروری ہے۔ ہوائی جہازوں کے دستے ان ناموں سے منسوب ہیں۔

(۱) بامبر (Bomber) یہ ہلکی قسم کے بھی ہوتے ہیں۔ درمیانی قسم کے بھی اور بامبر (Bomber Fighter) قسم کے بھی۔

(۲) فائٹر (Fighter) جنہیں فائٹر یعنی شکاری یا حملہ آور جہاز کہا جاتا ہے۔

(۳) فریٹر (Frieghter) یعنی بار برداری کے جہاز۔ ان میں گلائیڈر (Glider) بھی شامل ہیں۔ جس طرح موٹر گاڑی کے پیچھے ٹریلر (Trailer) باندھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سے گلائیڈر بھی مختلف قسم کے جہازوں کے پیچھے باندھے جاتے ہیں۔

بامبر۔ ہوائی جہازوں میں دشمن کی غارتگری کے لئے مختلف قسم کا اسلحہ ہوتا ہے۔ یعنی مختلف قسم کے بم (جن میں ایٹم بھی شامل ہیں) مختلف ساخت کی توپیں

مثلاً راکٹ (Rocket) مختلف قسم کی مشین گنیں۔ اس اسلحہ کو بامبر کی ساخت یا جن کاموں کے لئے اس کو استعمال کرنا ہوتا ہے۔ لگا دیا جاتا ہے۔

بامبر جہازوں سے مختلف قسم کے کام لئے جاتے ہیں مگر سب سے ضروری اور اہم کام دشمن کو تباہ و برباد کرنا ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی خطرناک کام ہے۔ اس مہم کو انجام دینے کے لئے بامبر بہت بڑی بلندی پر پرواز کرتے ہیں تاکہ دشمن کے ہوائی جہاز شکن توپخانے کی مار سے باہر رہیں۔ بامبر جہازوں کے دستے عموماً آپس میں مل کر کام کرتے ہیں گو بعض اوقات ایک دستے کے جہازوں (بامبروں) کو کسی خاص وجہ سے علیحدہ علیحدہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ دشمن کے حفاظتی جال میں سے کوئی نہ کوئی نکل کر دشمن پر غارتگری کر سکے۔ جب یہ دستوں میں مل کر کام کرتے ہیں تو وہ بامبر جو راہنمائی کرتا ہے۔ مخصوص نشانے پر بلندی سے بھی اپنے بم گراتا ہے اور باقی بامبر منصوبہ کے مطابق اسی جگہ یا قرب وجوار میں اپنے بم گراتے ہیں۔

بعض اوقات جب بامبر اپنے مخصوص نشانے کے قریب پہنچتے ہیں تو غوطہ (Dive) لگا کر نشانہ پر بم گراتے ہیں ایسا کرنے سے ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کا بم ٹھیک نشانہ پر بیٹھا ہے اور ایسے حملے کے اثرات دشمن کی ہمت کو پست کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ غوطہ زنی میں چونکہ بامبر زمین کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ لہذا وہ زمین سے حفاظتی گولہ باری کی زد میں آجاتا ہے اور یہ بامبر کے لئے انتہائی خطرناک وقت ہوتا ہے۔ ماضی میں بامبر عموماً بادلوں، بڑے بڑے جنگلوں اور پہاڑوں کی آڑ میں پرواز کر کے ایسا حملہ کرنے میں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ مگر راڈر نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اب ایسا حملہ بامبر یا کسی قسم کے جہاز کے لئے بہت ہی خطرناک ہوگا۔ کیونکہ پہلے ایسی آڑ لینے سے حملہ اور بامبر کی خبر حفاظتی ملک کو نہ ہو سکتی تھی۔ مگر اب دشمن کے لئے ایسی خبر حاصل کر لینا ممکن ہے۔ حالانکہ اس کے ساتھ ساتھ ایسے جدید ہوائی جہاز بھی بن رہے ہیں جو آواز کی لہر کی رفتار سے زیادہ تیز پرواز کر سکتے ہیں۔

ان بامبروں کے ذمے دشمن کے اہم اڈوں، فیکٹریوں، ریلوے کے بڑے بڑے جنکشنوں وغیرہ کو برباد کرنا ہوتا ہے۔ بامبر فائیٹر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایسا بامبر ہے جو کہ غارتگری بھی کر سکتا ہے اور اپنی حفاظت بھی آپ ہی کر سکتا ہے۔ بامبر بھاری اور جسامت میں بڑا ہونے کی وجہ سے شکاری ہوائی جہازوں کے مقابلے میں کم رفتار

ہوتا ہے۔ لہٰذا اُسے اپنی حفاظت کے لئے بسا اوقات فائٹر قسم کے ہوائی جہاز ساتھ رکھنے پڑتے ہیں تاکہ دشمن کے فائٹر جہاز کے خلاف اس کی حفاظت کر سکیں۔

فائٹر - ہوائی جہاز اپنی توپوں، بموں، مشین گنوں وغیرہ کی مدد سے دشمن کے بامبروں پر حملہ کرنے میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت ان کو دشمن کے حفاظتی یا مبر فائٹروں سے بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح دونوں طرف کے فائٹر ایک دوسرے سے ہوا میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو مار گرانے کی فکر کرتے ہیں۔ اس مڈبھیڑ کے فیصلے پر حملہ آور بامبروں کی سلامتی کا دارومدار ہوتا ہے۔

بالفاظ دیگر فائٹروں کا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے دشمن کے بامبروں کو اپنے علاقے میں گھسنے نہ دیں اور اگر وہ گھس آئیں تو بچ کر نہ نکلنے پائیں تاکہ ہر صورت میں دشمن کے بامبروں کے منصوبے کو ناکام بنا کر ملک کے اہم دفاعی اڈوں فیکٹریوں وغیرہ کو غارتگری سے بچایا جا سکے۔

فریٹر قسم کا ہوائی جہاز جیسا اس کے نام سے ظاہر ہے محض باربرداری کے کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ لہٰذا وہ حجم میں بھی بہت بڑا ہوتا ہے۔ اور بوجھ اور حجم کی وجہ سے اس کی رفتار بھی کم ہوتی ہے۔ یہ اپنی حفاظت خود نہیں کر سکتا ہے۔ اہم ضرورت کے وقت یہ جہاز ضروری اسلحہ۔ فوجی دستے۔ توپیں۔ جیپ گاڑیاں۔ زخمی فوجی رسد وغیرہ وغیرہ قسم کا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے یعنی ایسا سامان جو عام حالات میں بری یا بحری باربرداری اٹھاتی ہے۔ آج کل ہوائی جہاز عموماً انسان، جہاز رانوں کی مدد سے اڑائے جاتے ہیں مگر ایسے جہاز بھی موجود ہیں۔ جن کو ریڈار کی مدد سے اڑا کر کسی مقررہ مقام پر بھیجا جا سکتا ہے۔ اور ان کو ہوا میں معلق بھی رکھا جا سکتا ہے۔ ان کی مدد سے دشمن کے علاقے پر غارتگری کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے ہوائی جہازوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ جہاز رات دن مسلسل ہوا میں پرواز کر سکتے ہیں اور انسان کی طرح ان کو کھانے پینے، آرام یا سونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی اگر یہ راڈری جہاز دشمن کے جہازوں سے ٹکرا کر تباہ بھی ہو جائیں تو بھی حفاظت کرنے یا حملہ آور ملک کو جانی نقصان نہ ہوگا۔ جرمنی کے ہوا باز جب ۴۴-۱۹۴۳ میں بہت زیادہ میں مارے گئے تو اس ملک کو اعلیٰ پیمانے پر ہوا بازی کا فن سکھلانے میں بڑی دقت پیش آئی اور جرمنی کی شکست کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ راڈری ہوائی جہاز

انسانی ہوا بازوں کی طرح کسی مشینی وجوہ کی بنا پر یقینی طور سے اپنے نشانہ پر غالباً نہیں پہنچ سکتے۔

ہوائی جہاز کے ذریعے سے حملہ اور بچاؤ کے مسئلہ کو آسان بنا کر سمجھانے کی غرض سے ہم پہلے آپ کو یہ بتائیں گے کہ حملہ آور ملک اپنے بامبر کیسے بھیجتا ہے اور کس طرح سے ہوا باز اپنا فرض سرانجام دیتے ہیں۔ اس کے بعد حفاظتی ملک کے بچاؤ کی تیاریوں سے روشناس کرایا جائے گا۔

اس کو سمجھنے کے لئے آپ ایسے ملک کے ہوائی جہاز کے اڈے پر تشریف لے چلیں جو دشمن کے ملک پر ایٹم بم سے حملے کرنے کے لئے اپنے جدید قسم کے بامبر بھیج رہا ہے۔ خصوصی پرمٹ کی وجہ سے محافظوں نے ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت دے دی ہے ہوائی اڈوں پر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ اپنا یا پرایا ہوائی جہاز بھی بلا اجازت ان اڈوں کے گردو نواح میں اڑان نہیں کر سکتا۔ ان دفاعی اڈوں پر بلا اجازت اڑنے والے ہوائی جہازوں کو مار کر گرا لیا جاتا ہے۔ چاہے ایسے جہاز پر اپنے ملک کے نشان بھی کیوں نہ لگے ہوں۔

یہ سب بامبر قسم کے ہوائی جہاز ہیں اور یہ جہاز امریکہ کے B39, B47، اور B36 ,50 وغیرہ وغیرہ کے ہم پلّہ اور اسی قسم کے ہیں۔ یعنی جن ہوائی جہازوں سے ایٹم بم دشمن کے ملک پر گرائے جا سکتے ہیں۔ ان کے ہر انجن کی طاقت (50,000 ہارس پاور کے لگ بھگ ہے۔ گویا یہ جہاز حجم اور جسامت کے اعتبار سے عام تجارتی یا سواری کے ہوا باز جہازوں کے برابر یا کچھ بڑے نظر آ رہے ہیں۔ مگر ان بامبر جہازوں میں اس قدر سامان جمع کر دیا گیا ہے۔ کہ ان کے اندر ہوا بازوں کے بیٹھنے کے لئے بہت ہی کم جگہ ہے اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ یہ فوجی ہوا باز اس قدر بے آرامی اور تنگی میں تقریباً ۳۰ ۔ ۶ گھنٹے کس طرح سے گزار سکیں گے۔

ہر ایٹم بم والے بامبر کے جہاز ران اسی ایک جہاز کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اور وہ اس مخصوص جہاز کے ہر طرح سے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔ عموماً امن کے زمانہ ہی سے انہیں اپنے ملک کے دفاعی منصوبہ کے تحت ہر ایسے اٹمی بابر کو دشمن کے کسی خاص نشان یا مقام پر گولہ باری اور غارت گری کرنے کے لئے متعین کیا جاتا ہے۔ ان جہاز رانوں کی جماعت کو اپنے نشان یا نشانوں کا اچھی طرح سے علم ہوتا ہے
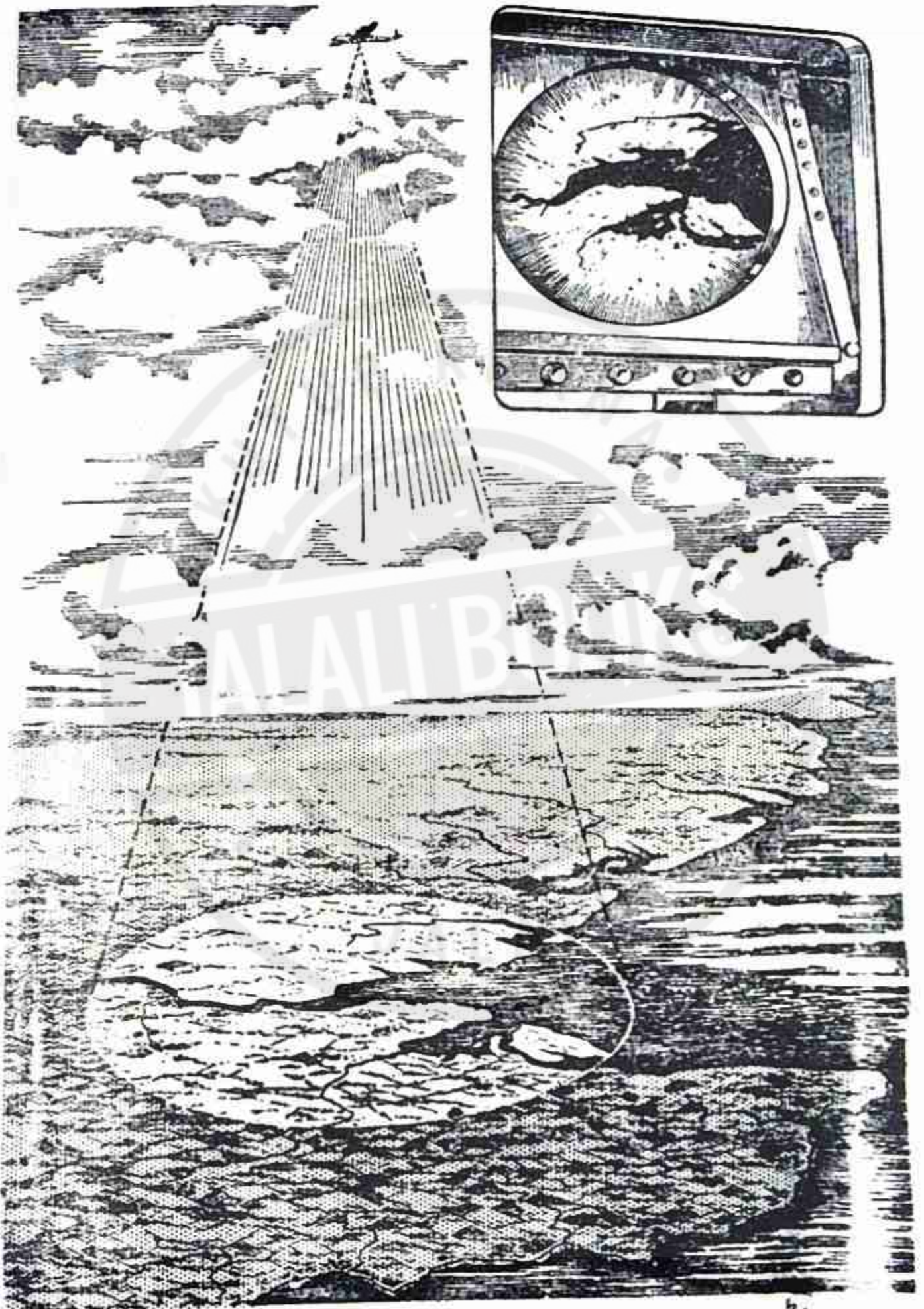
Radar. راڈر

اس لئے ان کو اپنے احکام کے بجا لانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ باوجود اس دور اندیشی کے پھر بھی حملہ کرنے کے وقت اور احکام دیتے وقت بہت احتیاط برتی جاتی ہے۔ ذرا ہم دیکھیں کہ ان کو ہدایات کیسے ملتی ہیں۔

ایک نہایت زبردست پہرے میں سے گزرنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کے بعد ہم آپ کو ایک ایسے کمرے میں لے چلتے ہیں جسے آپریشن روم (Operation Room) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ کمرہ ہے۔ جہاں محکمہ ہوائی دفاع کے افسران نقشہ جات اور ماڈل وغیرہ کے ذریعے سے ان ہوا بازوں کو احکام دیتے ہیں جن کو غارتگری کے لئے بھیجا جا رہا ہو تاکہ ہوا باز اچھی طرح سے احکام سمجھ لیں اور اگر کوئی شک ہو تو احکام بالا سے سوالات کر کے تمام شکوک رفع کرسکیں۔ اگرچہ ابھی دن کے گیارہ بجے کا وقت ہے مگر پھر بھی یہ کمرہ بجلی کے بڑے بڑے لیمپوں سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔

پہلے ایر مارشل (Air Marshal) کا سٹاف افسر اس جماعت کے نقشے پر دشمن کے اس نشان کو دکھاتا ہے۔ جس پر انہوں نے حملہ کرنا ہے اور ساتھ ساتھ تمام احکام کو نہایت واضح طور سے انہیں سمجھاتا ہے۔ مثلاً ہم اُسے یہ کہتے سنتے ہیں کہ "تم اس راستے سے پرواز کرو گے۔ یہاں سے دشمن کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا فاصلہ اتنے سو میل ہے۔ مگر دشمن کے ملک میں داخل ہونے سے پہلے فلاں جگہ اتنے بج کر اتنے منٹ پر تمہارے ہوائی جہاز میں ٹینکر (اڑنے والے) سے پٹرول بھرا جائے گا۔ تاکہ آپ کے پاس کافی مقدار میں پٹرول رہے۔ یہاں پر تمہیں غالباً دشمن کے حفاظتی دستے یا راڈر کا جال ملنے کا احتمال ہے پھر تم یہاں سے وہاں جاکر اس جگہ کو نشانہ بناؤ گے۔ وغیرہ وغیرہ غرضکہ جب ان جہازرانوں کے دل میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہتا تو نقشہ سے ذرا ہٹ کر ان کو تیار کردہ ماڈل (نمونہ) کے پاس لے جایا جاتا ہے جو کہ دشمن کے شہر یا نشانہ کے بالکل ہمشکل اور موافق ہوتا ہے۔ اب سٹاف افسر کہتا ہے "یہ دریائے ہر خطر ہے۔ جس کے دائیں کنارے پر اس شہر کا یہ باغ ہے۔ اس باغ میں یہ فیکٹری ہے یہ دشمن کے ایٹم بم بنانے کی فیکٹری ہے۔ اس مہم کا تمہارا نشانہ یہی فیکٹری ہے۔ اب اس ماڈل کو ہر پہلو اور مختلف بلندیوں سے غور سے دیکھ لو۔ ساتھ ساتھ وہ ان کو مختلف تصاویر بھی دیتا ہے۔

یہ جہازران ہر پہلو سے اس ماڈل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد سیڑھیوں پر چڑھ

کر دیکھتے ہیں کہ مختلف بلندیوں سے وہ کیسا نظر آئے گا۔ جب ان جہاز رانوں کا لیڈر (سالار) بالکل مطمئن ہو جاتا ہے تو اسے اس تمام سامان کی فہرست ملتی ہے جو اس کے بامبر میں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ سب جہاز ران نہایت احتیاط سے اس سامان کی جانچ پڑتال کرتے ہیں اور یہ بھی خیال رکھتے ہیں کہ ضرورت کے وقت کون سا سامان کہاں ملے گا۔ یہ بہت ہی ضروری ہے۔ کیونکہ ان کو نشانہ لگاتے وقت اس ضروری سامان کے ڈھونڈنے کے لئے صرف لمحوں کا وقت ملے گا۔

جب جانچ پڑتال ختم ہو جاتی ہے تو یہ جماعت سیڑھی کی مدد سے جہاز میں داخل ہو جاتی ہے اور اس جہاز کا پائیلٹ (Pilot) اور کو پائیلٹ (Co Pilot) یک دوسرے کے آگے پیچھے اپنی اپنی لوہے کی کرسیوں پر بیٹھ کر اپنے آپ کو پیٹی سے باندھ لیتے ہیں اس کا تیسرا ساتھی جس کا کام جہاز رانی ہے اور جسے نیویگیٹر (Navigator) کہتے ہیں بہت ہی تکلیف دہ جگہ میں چلایا جاتا ہے۔ جہاں وہ بمشکل کہیں ہل جل سکتا ہے۔ یہ جگہ بامبر کے سب سے آگے یعنی نوز (Nose) کے حصے میں ہے۔ اس جہاز ران کا کام برابر اور مسلسل یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا یہ جہاز صحیح سمت صحیح راستہ اور ٹھیک وقت پر فلاں فلاں مقام پر پہنچے گا یا نہیں اور وہ پائیلٹ کو اس کے متعلق برابر آگاہ کرتا جاتا ہے۔

اب جہاز کے انجن نہایت بھیانک اور کرخت آوازوں سے چلنے لگتے ہیں۔ اور جٹ کے پیچ خاب گرمی سے سُرخ ہو جاتے ہیں۔ اس جہاز کا سالار اڑان کے لئے کنٹرول (Control) سے اجازت مانگتا ہے۔ اجازت ملتے ہی پائیلٹ نہایت قابلیت سے پرواز کرتا ہے۔ اس وقت اس کا جہاز کم از کم 300 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرتا ہے۔ مگر جیسے ہی وہ 40,000 فیٹ کی بلندی کے لگ بھگ پہنچ جاتا ہے تو بامبر کی رفتار تقریباً 600 میل فی گھنٹہ کر دی جاتی ہے۔ جہاز رانوں کی یہ جماعت اپنی اپنی جگہ پر کبھی سائینٹ رول کی مدد سے اور کبھی نقشہ پر نظر ڈال کر باز مین کی طرف دیکھ کر اپنی سمت بلندی رفتار وغیرہ وغیرہ کا اندازہ کرتی رہتی ہے۔ غرضکہ یہ تین قالب مگر یکجان ہوتے ہیں۔ راہنما یعنی نیویگیٹر اپنے نقشہ پر کچھ پلاٹ کرتا جاتا ہے۔ اسی طرح سے سفر کرتے کرتے کئی گھنٹے گذر جاتے ہیں۔

نیویگیٹر نقشہ کے ساتھ ساتھ گھڑی کو بھی دیکھتا جاتا ہے۔ اسے خیال ہے کہ اب وہ اس جگہ کے قریب ہے۔ جہاں اڑتا ہوا ٹینکر ان کے بامبر میں پٹرول بھرے گا۔ اب اس

نے راڈر سکوپ (Radar Scope) کا مسلسل استعمال شروع کر دیا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے راڈر کے آلات کی سوئیاں بہت زیادہ متحرک ہیں یعنی فضا خراب ہے۔ جہاز بھی 630 میل کی رفتار سے چل رہا ہے۔ لہذا رفتار کو کم کر دیا جاتا ہے اب جہاز 580 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بامبر اپنے بوجھ کو وقت سے اٹھا رہا ہے۔ لہذا بامبر کی رفتار پھر بڑھائی جاتی ہے اور اب وہ 596 میل فی گھنٹہ سے اڑنے لگا۔ اب بامبر ٹھیک چل رہا ہے۔ اسی طرح وہ خطرے کے مقام سے گذر جاتے ہیں مگر پھر بھی سب چوکنے ہیں اور تیزی سے اپنی ہدایات پر نظرثانی کرتے ہیں۔ کیونکہ جن ماہرین نے اپنے دفاعی منصوبہ کے تحت یہ راستہ چنا تھا۔ انہوں نے بہت ہی باریک بینی سے اس راستے کے حالات و خطرات کے متعلق آگاہ کر دیا تھا۔ ادھر دشمن کی حدود قریب آنے لگی ہیں۔ لہذا خطرہ گذرنے کے بعد وہ باری باری سے ناشتہ کرتے اور ہاتھ پاؤں سیدھے کر لیتے ہیں۔ ان حالات میں ایسا کر لینا اس لیے ممکن ہے کہ ہر ایک جہاز ران کو ایک دوسرے پر پورا پورا اعتماد اور ان سب میں کامل یکجہتی ہے۔

نصف شب ہونے کو ہے اور یہ بامبر برابر اڑان کرتا چلا جا رہا ہے۔ ان جہاز رانوں کی ہمت پر آفرین وصد آفرین کہنا پڑتا ہے کہ سب کے سب تنگ وردی اور پھر تسموں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی ان کے ماتھے پر شکن تک نہیں۔ کیونکہ اپنی تکلیف دہ وردی پہننے کی عادت ہو گئی ہے۔ ان کے رگ پٹھے شل ہو گئے ہیں اور ان کے اعضا کی وہی حالت ہے جو اس عورت کی ہوتی ہے جو سر سے پاؤں تک بھاری بھاری گہنوں میں لدی ہوئی ہوتی ہے۔ اُسے شروع شروع میں تکلیف ہوتی ہے۔ مگر بعد ازاں پٹھے شل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ البتہ جب یہ بوجھ اتارا جاتا ہے اور ان رگ پٹھوں میں دوبارہ خون دورہ کرنے لگتا ہے تو درد کے ساتھ تھکان کا بھی پتہ چلتا ہے۔

نیوگیٹر آسمان پر ایک چمکتا ہوا متحرک ستارہ سا دیکھتا ہے۔ وہ اپنے ٹینکر کو پہچان لیتا ہے۔ ایک دوسرے سے راڈر یا تار برقی کے ذریعے بات کرنا منع ہے۔ ورنہ دشمن کو پتہ چل جائے گا۔ یہ ٹینکر بھی اپنے بامبر کو پہچان لیتا ہے۔ اور بامبر اس ٹینکر سے تین میل فی منٹ زیادہ تیز رفتار سے اڑان کر رہا ہے۔ لہذا اب وہ رفتار کو کچھ کم کر کے اس ٹینکر کے پیچھے پیچھے اس طرح سے اڑان کرتا ہے کہ اپنے ہک (Hook) سے بامبر اس ٹینکر سے ملاپ کر لیتا ہے۔ ملاپ ہوتے ہی پٹرول ٹینکر سے بامبر میں

بھرنا شروع ہو جاتا ہے اور تقریباً چار پانچ منٹ میں بامبر پٹرول کے بھر جانے کے بعد ٹینکر سے الگ ہو جاتا ہے۔ اب بامبر کا چونکہ ایک تو پٹرول سے وزن بڑھ گیا۔ دوسرے ٹینکر سے ملاپ کرتے وقت بلندی کم ہو گئی ہے۔ لہذا بامبر بھی بلندی اور رفتار کو دوبارہ بڑھا کر اپنی مہم کو سر کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔

دشمن کی سرحد سے کچھ ہی پہلے نیوگیٹر (راہنما) اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرتا ہے۔ کہ چوکنے رہو ہمارا نشانہ یہاں سے اننے سو میل ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد تار برقی سے حکم آتا ہے۔" تم کون ہو اور کدھر جا رہے ہو ٹھہر داور اپنی خفیہ پکار (Code) بتاؤ۔ اگر یہ پکار اپنے دوست کی طرف سے ہوتی تو کوڈ (Code) بتلاتے۔ ظاہر ہے کہ دشمن کے راڈر نے اس بامبر کو پالیا ہے۔ لہذا اب بامبر نکل جانے کی فکر کرتا ہے۔

نیوگیٹر پائیلٹ کو کہتا ہے" 25 ڈگری سمت دائیں بدلو اور چھ ہزار بلندی اور بڑھا دو۔" اسی طرح سے یہ بامبر ٹیڑھا ترچھا رفتار کو بڑھاتا گھٹاتا اُڑان کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے تاکہ دشمن کے جال سے بھی نکل جائے۔ مگر اپنے نشانے کو بھی نہ کھوئے ادھر حفاظت کرنے والے برابر اس کے سراغ میں رہتے ہیں۔ اور یہ بازی برابر جاری رہتی ہے۔

حفاظت کرنے والا ملک اس بامبر کے حملے سے بچنے کے لئے کیا تدابیر کرتا ہے اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ بہر حال یہ بامبر حفاظتی جال سے بچ نکلتا ہے اور نشانہ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

مصنف کا دونوں عالمگیر جنگوں کا تجربہ جو اس نے بچشم دید ایشیا اور یورپ کے میدان جنگوں خصوصاً ڈنکرک اور پھر بیٹل آف برٹن (Battle of Briton) میں حاصل کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دشمن کے لئے فیصدی جہاز حفاظتی جال کو توڑ کر اپنے نشانے کے **قریب** پہنچ گئے ہم نے قریب کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ کیونکہ فائٹر جہاز کی جھڑپ۔ توپخانے کے گولوں سے بچنا وغیرہ ایسے حالات ہیں۔ کہ حملہ آور بامبر کو اپنا راستہ نہایت ہی ٹیڑھا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور ان حالات میں نشانے کو صحیح طور سے نہ پہچاننا کوئی تعجب انگیز نہیں ہے۔ ان حالات میں گولے کا نشانے پر نہ بیٹھنا بھی تعجب خیز نہیں ہے۔ کیونکہ ان نہایت خطرناک حالات میں لڑنے کی پیچیدگی کے علاوہ بامبر کو بہت تیز رفتاری سے اُڑان کرنی پڑتی ہے۔ اپنے سفر

کو جاری رکھتے ہوئے اب ہم یہ سنتے ہیں کہ نیوگیٹر اپنے ساتھیوں کو کہتا ہے کہ" اب ان کا نشانہ 80 یا 90 میل کے فاصلے پر ہے"۔ لہذا وہ پائیلٹ سے سمت کو صحیح کرنے کے لئے کہتا ہے اور ساتھ ہی ان تصاویر کو جو وہ اپنے ہمراہ لایا ہے اور اس کی میز پر چسپاں ہیں۔ دیکھ کر اپنے راڈر کے شیشے کی تصاویر سے مقابلہ کر کے یقین کرتا ہے۔ کہ واقعی وہ صحیح جگہ پر ہے اور صحیح نشانہ پر جا رہا ہے۔ راڈر ایسی چیزیں مثلاً دریا۔ پل۔ ریل کی پٹڑیاں۔ ریلوے اسٹیشن۔ لوہے کی چمنیاں جو فیکٹریوں پر ہوتی ہیں اور مختلف عمارات کی تصاویر برقی لہروں کے ذریعے سے نیوگیٹر کے راڈر کے شیشے پر ڈالتا ہے۔ میز والی چسپاں تصاویر اور ان تصاویر کے مقابلے سے نیوگیٹر اپنے شکوک کو بار بار دُور کرتا رہتا ہے۔ یہ عام قسم کی تصاویر نہیں ہیں۔ بلکہ یہ وہ تصاویر ہیں جو کہ ماڈل سے مختلف بلندیوں کے مطابق بنائی گئی ہیں اور نہایت ہی صاف اور واضح ہوتی ہیں اور ان کی مدد سے نیوگیٹر یقین کر سکتا ہے کہ اب صحیح طور سے اپنے نشانے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سمت کو درست کرنے کے لئے وہ پائیلٹ سے برابر کہتا جاتا ہے" رفتار کو قائم رکھو۔ ہاں 10 ڈگری بائیں طرف۔ اب 5 ڈگری دائیں طرف۔ بس بس اب سیدھا چلو اور اس رستے پر قائم رہو"۔

اس جہاز کا نشانہ ایک بڑا شہر ہے۔ جو اس وقت بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ مگر راڈر کی تیز آنکھ اسے چیرتی ہوئی اس کے پار ہو جاتی ہے اور نیوگیٹر عمارتوں، دربار اور باغ اور گرجے کو دیکھ کر یقین کر لیتا ہے کہ یہی اس کا نشانہ ہے۔ اب وہ پائیلٹ کو پکار کر کہتا ہے" سیکنڈ اسٹیشن"۔

"سیکنڈ اسٹیشن" ایک ایسی مشین ہے جو کہ بامبر پر لگی ہوتی ہے اور اس کا ایک ہنڈل نیوگیٹر کے میز پر لگا ہوتا ہے۔ اس ہنڈل کے استعمال کرنے سے ہوائی جہاز پائیلٹ کے اختیار سے نکل کر نیوگیٹر کے قبضہ میں آجاتا ہے۔ اب اس جہاز کو نیوگیٹر اس آلے کی مدد سے بم سائٹ (Bomb Sight) کی مدد سے سیدھا نشانے پر بڑھاتا ہے اور راڈر اسکوپ کی مدد سے وہ اس شست اور سمت کو سیدھا اور برقرار رکھتا ہے۔ جب راڈر پر شست بیٹھ جاتی ہے تو مقررہ وقت اور تجویز کے مطابق سیکنڈ اسٹیشن کا آلہ ایٹمی بم کو خود بخود آزاد کر دیتا ہے۔ اس آلہ پر ایک گھڑی کی سوئی یہ دکھلاتی ہے کہ اب اس وقت کے 130 - 120 - 100 - 30 - 20 - 10 - 2 سیکنڈ کے بعد

ایٹمی بم آزاد ہو جائے گا۔ عین صفر کے وقت اس آلہ پر سرخ روشنی نمودار ہوتی ہے۔
اب یہ ایٹمی بم آزاد ہو چکا ہے اور تقریباً ۵۰۰ ر ۳۱ ہزار فیٹ کی بلندی سے نوسو فیٹ فی سیکنڈ یعنی دس میل فی منٹ کی رفتار سے اپنے نشانہ کی طرف گرتا ہے۔

نیو یگیٹر کے حساب میں پائیلٹ پکارتا ہے "سیکنڈ اسٹین اب تمہارے اختیار میں ہے"
عین اسی وقت نیو یگیٹر اپنے سکوپ سے شست لے کر بامبر کو نشانہ پر بڑھتا ہے جیسے ہی وہ سرخ روشنی دیکھتا ہے یعنی بم کے آزاد ہونے کے چند لمحوں کے بعد پائلٹ بھر جہاز پر قابو حاصل کر کے اپنے بامبر کے روانگی کی سمت کو بالکل بدل کر الٹی طرف گھما لیتا ہے
اسی اثنا میں بامبر کے جہاز ران ایک نہایت تیز بجلی کی سی چمک دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی ان کا بامبر ایک زبردست دھماکے کے اثر سے دہل جاتا ہے اور ان سب کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب ان کے بامبر کے ونگ (Wing) ٹوٹ کر الگ ہو جائیں گے۔
ایٹمی بم پھٹ گیا ہے۔ اب بامبر اسی وقت ایک خفیہ کوڈ (Code) سے اپنے ہیڈ کوارٹر کو تار برقی سے پیغام دیتا ہے۔ اس سے ہیڈ کوارٹر اندازہ لگا سکتا ہے کہ بم کس جگہ پر گرا۔

بامبر اب گھر واپس لوٹتا ہے اور ان کے سامنے ابھی کئی سو میل کی اڑان دشمن کے ملک میں باقی ہے بہر حال یہ بامبر بچ کر اپنے ہوائی اڈے پر واپس آجاتا ہے اور اترنے لگتا ہے۔ مگر یہ تو غضب کی تیز رفتاری سے اتر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامنے کی عمارات سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔ بس اسی وقت اس جہاز کے پچھلے حصے میں ایک چھتری (Parachute) کھل جاتی ہے اور جہاز رک جاتا ہے۔
اب پھر اس بامبر کے جہاز ران اپریشن روم میں جاتے ہیں۔ جہاں ان سے بہت سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ مگر اس بار یہاں ان جہاز رانوں کے لئے بسکٹ، کافی، سیگرٹ فیاضی سے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ کھاتے اور پیتے جاتے ہیں اور سوالات کا جواب دیتے جاتے ہیں۔

سوالات کے ختم ہونے پر یہ سب حمام میں جاتے ہیں۔ جہاں مادر زاد ننگے کر کے ان کی مالش کرنے کے ماہر خوب اچھی طرح سے ان کی مالش کرتے ہیں اور بعد از اں ان کو خوب گرم حمام میں نہلایا جاتا ہے۔ اب وہ اپنے اپنے گھروں کو خوب لمبی دیر تک سونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔

ہوائی حملوں سے بچاؤ

حملہ آور بامبروں کے تباہ کن آلات کا مقصد ایک ہی ہے۔یعنی بامبر کو مقصد حاصل کرنے سے پہلے تباہ کرنا - یہ آلات دو قسم کے ہیں:۔

۱۔ پہلی قسم کے آلات وہ ہیں جو بامبروں پر زمین سے آسمان کی طرف پھینک کر ان کو تباہ کرتے ہیں۔مثلاً امریکی توپ نائیک (Nike) جو راڈر سے 35,000 ہزار کی فیٹ کی بلندی پر سو فیصدی بامبروں کو مار کر گرا دیتی ہے۔اس قسم کے اور امریکی آلے لوکی (Loki) ٹیریر (Terrier) اور لارک (Larke) وغیرہ ہیں۔ یہ سب راڈر کی مدد سے راکٹ (Rocket) قسم کے گولے چلاتے ہیں۔ان کی حفاظت کرنے کا دائرہ صرف دس میل کی گولائی تک ہے۔ لہٰذا ایٹمی یا ہائیڈروجن قسم کے گولوں کے خلاف اس وقت تک کامیاب نہ ہوں گے۔جب تک کہ ان کو اپنے ملک سے باہر مثلاً سمندر وغیرہ میں بحری جہازوں پر لگا کر دشمن کے بامبروں کے خلاف استعمال نہ کیا جائے۔

۲۔ دوسری قسم کا آلہ وہ ہے جو حفاظت کرنے والا ملک دشمن کے بامبروں کے خلاف ہوا میں استعمال کرتا ہے۔یعنی اس میں فائٹر قسم کے ہوائی جہاز یا جدید قسم کے غبارے ہیں جو راڈر کی قسم کے آلات کی مدد سے ہوا میں معلق رہ کر دشمن کے بامبروں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ان راڈری آلات کے ہوائی جہازوں میں انسانی ہوا باز سوار نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ ہوائی جہاز یا غبارے راڈر ہی کی مدد سے اپنے نشانے کے خلاف کارروائی کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ غبارے یا ہوائی جہاز دشمن کے بامبر سے ٹکرا کر پاش پاش ہی ہو جائیں تو دشمن کا تو بامبر تباہ ہو جاتا ہے۔مگر حفاظتی ملک کا جانی نقصان نہیں ہوتا اور یہ مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ دشمن کا بامبر تباہ ہو گیا ہے۔

مغربی طاقتیں اپنے ملک کی حفاظت کے لحاظ سے دو نظریئے رکھتی ہیں:۔

۱۔ **پہلا نظریہ**:۔ اس کے تحت ہوائی حملوں سے خاص خاص مقامات کی حفاظت کی جاتی ہے۔اسے پوائنٹ ڈیفنس (Point Defence) کہتے ہیں - برطانیہ نے عالمگیر جنگ ثانی میں اسے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے بہت حد تک استعمال کیا۔اس طریقے میں بہت بڑا نقص یہ ہے کہ حفاظتی فوج کی طاقت بہت

جگہ پر بکھر جاتی ہے۔ اس لئے وہ کسی جگہ پر بھی موثر نہیں رہتی۔ لہذا ان حالات میں حملہ آور بامبر اچھی خاصی تعداد میں اس حفاظتی جال سے بچ کر نشانوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ کیونکہ اس طریقے سے حملہ آوروں پر صرف ایک ہی بار حملہ کیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ جنگ کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس طریقے سے صرف 20 فیصدی کے قریب جہاز گرائے گئے۔ باقی 80 فی صدی کے قریب اپنے نشانوں کے قرب و جوار میں پہنچ گئے۔ اور ان 80 فی صدی بامبروں نے صرف مالی نقصان کیا جو دفاعی نظریہ سے بہت کارگر نہ تھا۔ مگر اب ایٹمی زمانہ میں محض اس طریقے کو استعمال کرنا دانشمندی سے بعید ہو گا۔ آج کل رجحان دوسرے نظریئے کی طرف ہے۔

دوسرا نظریہ:۔ اس دفاعی منصوبہ کے تحت تمام آلات کو گہرائی میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اگر ہم قیاسی طور سے تصور کریں کہ امریکہ (USA) اور کنیڈا کو روسی حملے کا خطرہ ہے۔ اس حملے کے لئے دونوں طاقتوں کو لمبے لمبے فاصلے طے کرنے ہوں گے اور یہاں وہ حالات نہ ہوں گے۔ جن کا سامنا برطانیہ کو ہٹلر کے خلاف ۱۹۴۰ء میں کرنا پڑا۔ یعنی برطانیہ اور ہٹلر کی یورپی حکومت کے درمیان صرف چند میل چوڑا سمندر تھا۔ مگر ان حالات میں طرفین کو یا تو کئی سو میل سمندر پر سے پرواز کرنا پڑے گا۔ یا پھر الاسکا (Alaska) یا گرین لینڈ (Greenland) پر سے اڑان کرنا ہوگی۔ لہذا ان امریکی حکومتوں نے اپنے ارد گرد مکڑی کے جال کی طرح سے حفاظت کے اڈے قائم کر لئے ہیں۔ تاکہ حملہ آور اگر کسی وجہ سے ایک جال میں سے بچ کر نکل جائے تو دوسرے جال میں پڑ کر تباہ ہو جائے۔ اس حفاظتی جال کو مضبوط بنانے کے لئے بہت سی نئی ایجادیں ظہور میں آ رہی ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ عالمگیر جنگ ثانی میں معمولی قسم کا راڈر استعمال کیا گیا۔ ان آلوں میں خامیاں تھیں۔ مثلاً پہاڑوں کی آڑ۔ یا جنگلوں کی آڑ کے ساتھ ساتھ بامبر اڑان کر سکتے تھے۔ کیونکہ ان حالات میں راڈر اندھا تھا۔ علاوہ ازیں پرانے قسم کے راڈر اپنے دشمن کے جہاز کو صحیح طور سے پہچان نہیں سکتے تھے یہی وجہ تھی کہ آنے والے بامبر سے سوال کیا جاتا تھا کہ تم کون ہو؟ اپنی خفیہ پکار بتاؤ۔ نئی قسم کے راڈر سے حملہ آور بامبر کو پتہ نہیں چلے گا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے اور اس کی نقل و حرکت کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ تاکہ مناسب موقعہ پر اسے تباہ کیا جا سکے۔ اس ایجاد کی مدد سے دشمن کے حملہ آور بامبر کو اپنے علاقے سے کہیں دور پہچان کر تباہ کیا جا سکے گا۔

۲۔ اسی طرح اب کنٹرول کو راڈر کے ذریعے دشمن کے آنے کی اطلاع ملے گی۔ اور اس سلسلہ میں خبر رسانی کی رفتار آواز کی رفتار سے تیز ہوگی۔ کیونکہ اب ایسے جہاز ایجاد ہو گئے ہیں جو آواز کی رفتار سے تیز اڑان کرتے ہیں۔ اس نئی ایجاد سے لمحہ کے عشر عشیر حصہ میں دشمن کا جہاز پہچانا جا سکتا ہے۔ اور اس کی خبر کنٹرول کو بھیجی جا سکتی ہے۔

۳۔ سب سے مفید ایجاد حفاظتی لحاظ سے راڈر کا مشینی دفاع ہے۔ جس کی مدد سے ہوائی جہاز انسان ہوا باز کے بغیر اڑا کر دشمن کے علاقے اور ان حملہ آور یا بمبروں کی طرف بڑھائے جا سکتے ہیں۔ یہ دفاع صحیح فاصلہ اور سمت اور زد آنے پر خود بخود اپنے دشمن کے ہوائی جہاز پر مختلف آلات مثلاً راکٹ کے گولوں سے حملہ کر سکتا ہے۔ یہ جہاز مسلسل ہوا میں معلق رکھے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ نہ تو ان کو کھانے پینے کی ضرورت ہے نہ آرام کی۔

علاوہ ازیں ان نئی ایجادوں کی مدد سے حملہ آور یا بمبر کے آنے کی اطلاع بجائے چند منٹوں کئی گھنٹے پہلے مل جایا کرے گی۔ اسی طرح سے حفاظتی کارروائی میں آسانی ہوگی

سب سے بڑا زبردست حربہ جو کسی ملک کو سو فی صدی امن اور سلامتی میں رکھ سکتا ہے۔ وہ اس کی اپنی طاقت ہے۔ جس کے بل پر وہ حملہ آور کے حملے کا جواب اینٹ کی بجائے پتھر سے دے سکتا ہے۔ جب مخالفین کو اس قسم کے جوابی حملے کا یقین ہو جاتا ہے تو حملہ کرنے کی جرأت ہی نہیں کرتے۔ یہ ایسا دفاعی اصول ہے کہ جس کو جس قوم۔ ملک یا حکومت نے نظر انداز کیا وہ پستی میں پڑ گئی ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرتِ پاک پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں اسلامی جنگوں کو بھی بہتر انداز میں پیش کیا گیا۔ لیکن آج تک کسی مصنف نے حضورؐ کے ماہرانہ جنگی نظام کی خوبیوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اب جبکہ ملٹری کو بھی سائنس کے انداز میں سمجھا جانے لگا تو تحقیق شروع ہوئی کہ وہ کونسا بڑا انسان تھا۔ جس نے سب سے پہلے جنگ کو فساد و خوں ریزی کی بجائے ایک سائنس میں ڈھال دیا۔ یہ عظیم الشان کام آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کے ایک امی نبیؐ نے دنیا کے سامنے رکھا۔ مگر قوم نے ان کارناموں کو بھلا دیا۔

میجر جنرل محمد اکبر خاں نے اس بھولی بسری کہانی کو مسلمانوں کے قلوب میں از سرِ نو زندہ کرنے کے لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک کے اس پہلو کو اُجاگر کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ میجر جنرل کا یہ کارنامہ یقیناً مسلمان قوم سے خراجِ عقیدت وصول کرے گا۔

اُردو ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی اور انوکھی کتاب ہے اور مسلمانوں کے مُردہ دلوں میں خونِ زندگی دوڑانے کا ایک ذریعہ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اسلامی زندگی کے صحیح خدوخال اُبھرنے لگتے ہیں۔ فوجی جوانوں کے علاوہ عام مسلمانوں کے لئے بھی اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

ظاہری و باطنی خوبیوں اور خوبصورت گردپوش سے آراستہ،

قیمت مجلد پانچ روپے

فیروز سنز

پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز

لاہور ——— کراچی ——— پشاور